قیام دارالعلوم دیوبند

ایک غلط فہمی کا ازالہ

رشحات قلم

مُفتی مُحمّد سعید خان

ندوۃ المُصنّفین الندوۃ ایجوکیشنل ٹرسٹ اسلام آباد

E-Mail: alnadwa@seerat.net

www.seerat.net

0333 83 83 337

قیام دارالعلوم دیوبند
ایک غلط فہمی کا ازالہ

مفتی محمد سعید خان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سال گذشتہ (2011ء) کے آغاز میں ہمارے دیرینہ کرم فرما محترم جناب سجاد الٰہی صاحب — جو ماشاء اللہ نہایت سنجیدہ، صاحبِ مطالعہ، مجالس علمی کی باغ و بہار شخصیت اور ہندوستان سے جتنے بھی علمی رسائل چھپتے ہیں تقریباً ان سب کی تقسیم (Distributing) کی سعادت اور شرف انہیں حاصل ہے، بارک اللہ فی حیاتہ — کا فون آیا اور انہوں نے یہ خوش خبری سنائی کہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد (Ineternational Islamic university isb) میں از 26 تا 28 مارچ 2011ء کو جو سیرت کانفرنس منعقد ہورہی ہے، اس میں شرکت کے لیے ہندوستان سے ایک وفد آرہا ہے، جس میں جناب پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی صاحب بھی تشریف لارہے ہیں۔ اس خوش خبری کو سن کر دل بلیوں اچھلنے لگا کہ وہ ہستی تشریف لارہی ہے، جس سے اگر کوئی واقف نہیں تو

ع آپ بے بہرہ ہے، جو معتقد میر نہیں

مکرم جناب یٰسین مظہر صدیقی صاحب کے مضامین ایک عرصہ سے زیر مطالعہ آرہے تھے وہ شعبہ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق ڈائریکٹر اور شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل کے سابق چیئرمین

بھی رہے ہیں۔ اور اپنا گمان یہ ہے کہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے بعد یہ پہلی ہستی ہے جو سیرتِ نبویہ علی صاحبہا الف الف التحیۃ والثناء کے بہت سے مخفی اور شاندار نئے گوشے اُردو زبان میں آہستہ آہستہ اُمت کے سامنے لا رہی ہے۔ بذریعہ فون گاہے ماہے ان سے رابطہ ہوتا رہتا تھا اور اب شنید کو دید سے تبدیل کرنے کا موقع آرہا تھا۔ جناب پروفیسر یٰسین مظہر صاحب بھی غائبانہ محبت کا اظہار فرماتے رہتے تھے اور پاکستان میں اپنے چاہنے والوں پر اظہار شفقت کے لیے انہوں نے جو یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں:

> ''محترم مولوی عبدالعزیز (دبئ)، ڈاکٹر جمیل مانوی (سہارنپور)، مفتی سعید احمد خاں (اسلام آباد) کے علاوہ خاکسار کے عظیم ترین کرم فرماؤں میں جاوید طفیل، مدیر نقوش اور ان کے ہم وطن حافظ سجاد الٰہی صاحب اور ان سب کے سلاسلِ عزیزیہ، مانویہ، سعیدیہ، جاویدیہ، اور سجادیہ اپنی عنایتوں، دعاؤں اور تبصروں سے برابر حوصلہ افزائی فرماتے اور ذرۂ بے مقدار کو باوقار بناتے رہتے ہیں۔''

(عہد نبوی ﷺ کا تمدن، زیرعنوان، تقدیم ص:۲۲)

ہم سب کے لیے تاحیات باعث فخر ہیں۔

24 مارچ 2011ء، کو آغاز شب انتظار کی یہ گھڑیاں ختم ہوئیں اور اسلام آباد ائیر پورٹ پر ان کی آمد ہوئی۔ دیکھا تو پورا ایک وفد ان کے ہمراہ تھا اور جناب پروفیسر صاحب موصوف کے علاوہ ہندوستان کے معروف اہل علم وقلم اور قابل صد احترام دیگر سات شخصیات

① جناب ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب
② جناب ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی صاحب
③ جناب ڈاکٹر عبداللہ فہد فلاحی صاحب
④ جناب ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی صاحب
⑤ جناب ضیاء الدین فلاحی صاحب
⑥ مدیر تحریر مجلّہ ترجمان دارالعلوم جناب وارث مظہری صاحب
⑦ جناب غطریف شہباز ندوی صاحب (ڈائرکٹر فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز)

رنجہ فرما ہوئیں، سب کو دیکھ کر افسردہ طبیعت کی کلی کھل اُٹھی اور اہل علم کے اس مؤقر وفد کو دیکھ کر اظہار جذبات کو جی چاہا لیکن اپنی کم آمیزی اور اظہار جذبات کو ضبط کرنے کی بڑی عادت یہ کہہ کر رہ گئی۔

ے
عشق عصیاں است اگر مستور نیست
کشتۂ جرم زباں مغفور نیست

کچھ حضرات اپنے ساتھ گاڑی پر سوار ہوئے اور خوشگوار نوک جھونک کے ساتھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس (University old campus) کے مہمان خانے میں عشائیہ اور اس کے بعد بھی ایک مجلس رہی۔

یہ مؤقر وفد جب اپنے دیش ہندوستان پلٹ رہا تھا تو لاہور ائیر پورٹ پر پھر ان کی خدمت میں حاضری رہی اور پرواز میں تاخیر کی وجہ سے پھر ایک طویل مجلس کا موقع ملا۔ جہاں تک علم ہو سکا ہے بھارت واپس پہنچ کر اراکین وفد میں سے صرف دو حضرات نے اپنے اپنے جرائد میں اس سفر پر تبصرہ فرمایا ہے۔ ایک تو جناب محترم وارث مظہری صاحب دام اقبالہ مدیر تحریر مجلّہ ''ترجمان دارالعلوم دیوبند'' ہیں اور دوسرے محترم ومکرم جناب غطریف شہباز ندوی صاحب دام مجدہ (ڈائرکٹر فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز) ہیں۔ ان دونوں حضرات کے تاثرات آپ اس مضمون کے پیش آمدہ صفحات میں پڑھ سکیں گے لیکن چونکہ برسر مطلب محترم جناب وارث مظہری صاحب دام اقبالہ کا تبصرہ ہے اس لیے پہلے اسے نقل کیا جا رہا ہے۔ وہ اپنے مجلّے ترجمان ''دارالعلوم'' بابت ماہ اپریل تا جون ۲۰۱۱ [ص: ۲۱۵۔۲۱۷] میں تحریر فرماتے ہیں۔

> ''رات میں کھانے کی میز پر مختلف اہم میزبان شخصیات میں سے ایک مفتی سعید صاحب بھی تھے۔ لاہور کے کرم فرما سجاد الٰہی صاحب سے ہماری فون پر باتیں ہوتی رہی تھیں۔

انہوں نے کہا تھا کہ مفتی صاحب ہم سے اسلام آباد میں ملیں گے اور لاہور آنے کی راہ ہموار کریں گے۔ کیوں کہ ہمارا ویزا صرف اسلام آباد کے لیے ہی مخصوص تھا۔ اس لیے ان سے بطور خاص ملنے سے دلچسپی تھی۔ سجاد الٰہی صاحب ایک بہت بڑے تاجر ہیں لیکن اسی کے ساتھ نہایت علم دوست۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی موضوعات پر ہندوستان سے شائع ہونے والی اہم اُردو کتابیں اور درجنوں رسائل ومجلّات منگوانے اور انہیں اہل ذوق تک پہنچانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہمارے میزبانوں نے بتایا کہ مفتی صاحب نہایت متمول ہونے کے ساتھ سیاسی اثر ورسوخ کے حامل اور علمی ذوق کے مالک ہیں چنانچہ ان کا ایک ذاتی کتب خانہ بڑی تعداد میں اہم کتابوں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے مسترشد اور خلیفہ ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ''مفتی'' ان کے نام کا جز تھا یا حقیقت میں انہوں نے افتاء کی تعلیم حاصل کی ہوئی تھی۔ کھانے کی میز پر ان کی خوش طبعی اور اخلاق وتواضع متاثر کن تھا۔ لیکن ان کی باتیں بہت سنجیدہ نہیں تھیں۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ چھیڑ چھاڑ والی تھیں۔ ایک بات تو انہوں نے ایسی کہی جو ہم میں سے کسی کو بھی ہضم نہیں ہو پائی۔ انہوں نے فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند کی جو پہلی تعمیر ہوئی ہے، اس کے لیے ضروری اراضی بانی دارالعلوم کو انگریزی حکومت نے عطا کی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی تاسیس میں انگریزی حکومت کے کارندے بھی شریک تھے۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ خود انگریزی حکومت کے تعاون واشتراک سے دارالعلوم کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ انہوں نے اس کے لیے ''بشارت'' نامی کتابچے یا تحریر کا حوالہ دیا جو ان کے بقول خود دارالعلوم کی ابتدائی روئیدادوں میں شامل ہے۔ میری اس بات کو انہوں نے سرے سے قابل اعتنا نہیں سمجھا کہ دارالعلوم دیوبند کے مخالفین نے، جن کی تعداد ماشاء اللہ کم نہیں ہے، ہندوستان وپاکستان سے لے کر بعض عرب ممالک تک مختلف زبانوں میں اس کے خلاف درجنوں کتابیں لکھ کر نفرت پھیلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، کبھی ایسا الزام اس پر نہیں لگایا۔ حالاں کہ ان کے لیے یہ انکشاف اسامہ بن لادن کی

> پاکستان میں موجودگی اور ہلاکت سے کم سنسنی خیز نہیں تھا۔ جنگ شاملی کے جرم میں مولانا قاسم نانوتوی سمیت بانیان واکابر دارالعلوم دیوبند کا ہمیشہ حکومت کی طرف سے تعاقب کیا جاتا رہا۔ رشید احمد گنگوہی گرفتار ہوکر جیل بھی گئے۔ لیکن مفتی سعید صاحب کے لیے گویا یہ ساری باتیں بے معنی تھیں۔ وہ اخیر تک ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' پر ہی مصر رہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے مرشد مولانا ابوالحسن علی ندوی کے لیے بھی یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہوتی۔ اس نشست میں انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کی مزعومہ شراب نوشی پر بھی گفتگو چھیڑ دی جس سے طبعی تکدر فطری تھا۔''

یہ مجلّہ جب پاکستان آیا تو بہت سے محبین ومخلصین کی نظر سے گزرا۔ سب سے پہلے محترمی ومحبی اور اپنے اکابرین رحمہم اللہ کے عاشق زار حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مدظلہم کا فون مکتبہ قاسمیہ ۱۷۔ اُردو بازار لاہور سے آیا اُن کے الفاظ تو حرف بحرف یاد نہیں لیکن مفہوم یہ تھا کہ توقع تو نہیں کہ ایسی کوئی غیر ذمہ دارانہ بات ہوئی ہو لیکن اصل ماجرا کیا ہے؟ اپنی لاعلمی اور حیرت کا اظہار کیا اور عرض کیا کہ مجلّہ دارالعلوم دیکھ کر ہی کچھ عرض کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے انہوں نے اس مضمون کی فوٹو کاپی ارسال فرما دی۔ اس کے بعد جب آنجناب محترمی ومکرمی مولانا عبدالجبار سلفی صاحب کا فون آیا تو اصل عبارت کی وہ فوٹو کاپی نظر سے گزر چکی تھی اس لیے ادھر سے حقیقی صورتحال واضح کر دی گئی انہوں نے اپنی صالح طبیعت کی بنا پر اصولی طور پہ یہ بہت اچھا کام کیا کہ صاحب معاملہ سے وضاحت چاہی اور قبل اس کے کہ اس معترضانہ عبارت پر کوئی تبصرہ کیا جائے کیوں نہ اصل صاحب معاملہ سے رجوع کر لیا جائے۔

مخدومی ومکرمی جناب سجاد الٰہی صاحب کا فون آیا اور فرمانے لگے کہ مجھے یقین ہے ایسی گفتگو تو نہ ہوئی ہوگی لیکن کوئی غلط فہمی ہو گئی ہوگی۔ اصل مسئلے کہ تہہ تک وہ پہنچ گئے اور یوں ان تینوں احباب حفظہم اللہ کا اضطرار سکون پذیر ہوا۔ ان تینوں حضرات میں سب سے زیادہ قابل احترام ہستی جناب

مولانا نعیم الدین صاحب مدظلہم کی تھی کہ جس مدرسے کے وہ فارغ التحصیل ہیں، اسی در کی خاکروبی کچھ عرصے کے لیے پچھ اور گنہگاروں کو بھی نصیب ہوئی ہے اور انہیں حضرت اقدس مدنی نوراللہ مرقدہ سے جو نسبت بالواسطہ نصیب ہے، وہ ہر طرح سے قابل لحاظ واحترام ہے، اپنے رشتے کے اعتبار سے وہ حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے داماد اور بیک واسطہ ان کے خلیفہ بھی ہیں۔

اسی اثنا میں محترم ومکرم جناب مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب مدظلہم کا پہلا گرامی نامہ موصول ہوا۔ وہ بھی ہر طرح سے قابل احترام کہ انہیں بھی بیک واسطہ حضرت مدنی نوراللہ مرقدہ سے ایک نسبت حاصل ہے۔ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے داماد ہونے کا شرف مسلم اور ہمیشہ محبت اور عزت واحترام کا سلوک اس پر مستزاد۔ مدنی حلقے میں یہ روایت اب تک برقرار ہے کہ جس جس کا تعلق اس در دولت سے ہے، خواہ بالواسطہ ہی کیوں نہ ہو، قابل احترام ہے۔ مخدوم ومکرم جناب مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب مدظلہم نے جو پہلا گرامی نامہ تحریر فرمایا تھا وہ یہ تھا۔

بگرامی خدمت حضرت مفتی صاحب زید مجدکم

[دیوبند انڈیا] السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

گذشتہ دنوں مجلہ ترجمان دارالعلوم اپریل جون ۲۰۱۱ء دیکھنے کو ملا۔ جس میں وارث مظہری صاحب کا سفر نامہ "اسلام آباد کا سفر" کے عنوان سے شائع ہوا۔ یقیناً آنجناب کی نظر سے گذر چکا ہوگا۔

وارث مظہری صاحب نے آپ کے حوالہ سے لکھا کہ:-

"انہوں نے فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند کی جو پہلی تعمیر ہوئی ہے۔ اس کے لئے ضروری اراضی بانی دارالعلوم کو انگریزی حکومت نے عطا کی تھی؟"

اس حوالہ سے کوئی رائے قائم کرنے یا تبصرہ کرنے اور آگے نقل کرنے سے قبل دیانتاً ضروری خیال کیا کہ آنجناب کی رائے معلوم کرلی جائے۔ امید ہے انتظار کی کوفت سے بچاتے ہو جلد اپنے نکتۂ نظر سے آگاہ فرمائیں گے۔

والسلام
زاہد حسین رشیدی
27 ستمبر 2011ء

27 ستمبر 2011ء کا یہ گرامی نامہ ملتے ہی جناب عبد الجبار سلفی کو فون کیا انہوں نے یہ فرمایا کہ اس موضوع کو زیر بحث نہ لایا جائے کیونکہ بسا اوقات ایسی مباحث جواب الجواب کے درجے تک پہنچ جاتی ہیں اور آپس کی یہ مباحث مناسب نہیں۔ چنانچہ جناب مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب مدظلہم کے اس گرامی نامے کے جواب کی بجائے محترم و مکرم جناب سلفی صاحب نے ان سے فون پر بات کرنے کی ذمہ داری لی اور اس وجہ سے اطمینان ہو گیا اور جب بھی ذہن میں اس گرامی نامے کے جواب کی اخلاقی ذمہ داری کا احساس بیدار ہوا تو یہی تسلی رہی کہ دونوں بزرگوں کی گفتگو ہو گئی ہو گی۔ محترمی جناب مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب جس خوبصورت اور مؤدبانہ انداز سے ایک اصولی خط لکھا تھا وہ اس وقت بھی اور آج بھی قابلِ ستائش اور لائق تقلید ہے کہ جس شخص کے متعلقہ تحریر، قابل اضطراب ہے، اس اصل شخص سے ہی اس کا کلام اور اس کے مطالب و معانی دریافت کر لیے جائیں بلاشبہ دنیا میں مخلصین کا طریق کار یہی ہے۔

ہم سب کا تعلق بلا واسطہ یا بلواسطہ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مجاز حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی بنا کردہ جماعت ''تحریک خدام اھل السنۃ والجماعۃ'' سے ہے اور یہ بات حد درجہ لائق تحسین ہے کہ ایک ہی مقصد کے تحت کام کرنے والے افراد کو ایک دوسرے کی تحریر یا تقریر کے متعلق کوئی الجھاؤ پیش آجائے تو وہ اس مسئلے کو آپس میں بیٹھ کر حل کر لیں اسی جذبے سے محترمی جناب زاہد حسین رشیدی صاحب نے مندرجہ بالا گرامی نامہ تحریر فرمایا اور یہ سطور بھی اسی جذبے کے تحت لکھنے کی نوبت آئی۔

کتاب ''سورتیں اور آیات جو ہر مسلمان کو روزانہ پڑھنی چاہییں'' جو کہ اگست میں مکمل ہو چکی تھی اور بعض مشکلات کی بنا اس کے چھپنے میں تاخیر ہو رہی تھی، اس کی وجہ سے مصروفیات کافی زیادہ تھیں کہ مخدومی جناب مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب مدظلہم کا دوسرا گرامی نامہ موصول ہوا، جو کہ یہ ہے۔

بگرامی خدمت حضرت مفتی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آں محترم کی طرف سے " سوانح امداد آیات " موصول ہوئی۔

جزاکم اللہ احسن الجزاء

جلد کاغذ پرنٹنگ وغیرہ میں جس نفاست کا لحاظ رکھا گیا ہے اس سے اس گراں قدر ذخیرہ کو جو چار چاند لگ گئے ہیں سو لگے ہیں ساتھ ساتھ اہتمام کرنے والوں کا حسنِ ذوق اور عقیدت بھی آشکار ہوئی ہے

خدا تعالیٰ مجھ سمیت پوری امت کو استفادہ کی توفیق بخشیں۔

(۲) وارث مظہری صاحب کے مندرجات کی توضیح کا آں جناب نے جو وعدہ فرمایا تھا تا حال وفا نہیں ہو سکا۔

کسی بھی چیز کے نقصان سے بسا اوقات آپ جیسے بڑے اتنے آگاہ نہیں ہو سکتے جتنے ہم چھوٹے کثرتِ مجالست یا بے تکلفی کی وجہ سے ہو جاتے ہیں میری گزارش کی بنیاد یہی ہے۔

باقی رہے نصیب جو مزاجِ یار میں آئے

والسلام مع الاحترام

30 اکتوبر 2011ء

بانی قائد اہل سنت وکیل صحابہ حضرت قاضی مظہر حسین ... خطیب مدنی جامع مسجد چکوال

Tel: 0543-554566 Fax: 0543-550860 Mob: 0300-9470582 E-mail: haqcharyar2000@yahoo.com

یہ گرامی نامہ دیکھ کر حیرت ہوئی اور محترمی جناب عبدالجبار سلفی صاحب مدظلہم سے فون پر بات کی کہ خیال یہ تھا کہ آپ کی گفتگو ہو چکی ہوگی اس لیے یہ سمجھا گیا تھا کہ معاملہ بخیر وخوبی حل ہو گیا ہوگا، لیکن اس گرامی نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکا، یہ بات قابلِ افسوس ہے اب کیا حل کیا جائے؟ تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ جناب مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب مدظلہم کو کچھ تحریر نہ کرو، میں خود انہیں خط لکھ دیتا ہوں اور اس کی ایک عدد کاپی آپ کو بھی ارسال کر دوں گا۔

اسی اثنا میں ایک اور مہربان اور علم دوست شخصیت جناب محترم شبیر میواتی صاحب سے بھی مشورہ ہوا اور انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ جب محترم جناب عبدالجبار سلفی صاحب نے ذمہ داری لے لی ہے تو وہ ان شاء اللہ اسے نبھا لیں گے۔

اگر چہ ہمیشہ سے طور وطریقہ یہی رہا ہے کہ کسی بھی مدح وذم کی پرواہ کیے بغیر مثبت کاموں میں اپنا وقت اور صلاحیتیں کھپاتے چلے جانا چاہیے لیکن ایسے بھی کیا اندھیر نگری مچے کہ آنمخدوم جناب زاہد حسین رشیدی صاحب ایک بات کی وضاحت کے لیے دوسرا گرامی نامہ تحریر فرمائیں اور باعث شرم ہے کہ انہیں چار سطروں کا جواب بھی تحریر نہ کیا جا سکے۔ اضطراب بڑھتا رہا اور آخر یہ تمام قضیہ امیر جماعت تحریک خدام اھل السنۃ پاکستان حضرت مولانا قاضی محمد ظہور الحسین اظہر صاحب مدظلہم کی خدمت میں پیش کیا کہ اس پر جو بھی حکم صادر فرمائیں۔ حضرت الامیر دامت برکاتہم اس سے پہلے منع فرما چکے تھے کہ کسی قسم کی تحریر کا جواب نہیں لکھنا اور اپنی صلاحیتوں کو مفید کاموں میں استعمال کرنا ہے لیکن اس کے باوجود عرض کرنے کی جسارت کی کہ اس گرامی نامے کا جواب تحریر کر دیا جائے۔ جواب کچھ بہت ہلکی سی ڈانٹ کے ساتھ یہ ملا کہ منع جو کیا ہے کہ کسی تحریر کا جواب نہیں لکھنا، پھر کیوں جواب لکھنے پہ اصرار ہے؟

حضرت الامیر دامت برکاتہم نے اعتراضات واشکالات کے جواب دینے سے جو تحریراً منع فرمایا تھا، اس کی اصل اُن کا وہ بیان ہے جو کہ ماہنامہ ''حق چار یار رضی اللہ عنہم'' جو کہ تحریک خدام اھل السنۃ والجماعۃ کا ترجمان ہے۔۔۔ میں پچھلے برس یعنی اپریل 2011ء میں بعنوان ''ایک ضروری وضاحت'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس کا عکس ذیل میں دیا جارہا ہے۔

مفتی محمد سعید خان کے بارے میں امیر تحریک خدام اہل سنت والجماعت
قاضی محمد ظہور الحسن اظہر کی طرف سے ایک ضروری وضاحت

جناب مفتی محمد سعید خان صاحب 2008ء سے تحریک خدام اہل سنت والجماعت سے باقاعدہ وابستہ ہوئے ہیں، ہم نے ان میں کسی قسم کی عقیدہ وعمل کی خرابی نہیں دیکھی۔ ان

کے عقائد واعمال اہل سنت والجماعت کے بالکل مطابق ہیں ۔اللہ تعالیٰ ہمیں اور انہیں اپنے اکابرین اہل سنت والجماعت کے عقائد واعمال پر استقامت بخشے ۔

تحریک خدام اھل السنۃ والجماعۃ اور جناب مفتی محمد سعید خان صاحب کے تعلق کی حالت یہ ہے کہ ہم نے انہیں جب بھی اور جہاں بھی اپنے سٹیج پر بلایا ہے انہوں نے مکمل تعاون کیا ہے ۔بحمدہٖ سبحانہ وتعالیٰ ان کی تقاریر سے اہل سنت والجماعت کو مسلسل فائدہ پہنچ رہا ہے، وہ اپنے بیانات میں مرزائیت ، رافضیت ، خارجیت ،منکرین حدیث وفقہ، بدعات اور جدید گمراہ کن نظریات کا ہمیشہ ردّ کرتے رہے ہیں۔

جناب مفتی صاحب کے خلاف اب جو الزامات اور تحریرات کا سلسلہ شروع ہوا ہے، ہم ان تمام الزامات کو بے حقیقت سمجھتے ہیں اور جناب مفتی صاحب کی ان الزامات سے مکمل برأت کا اعلان کرتے ہیں نیز میں مفتی صاحب کو ہدایت کرتا ہوں کہ آئندہ کسی تحریر کا کوئی جواب آپ کے کسی ساتھی کی طرف سے نہ آنا چاہیے اور آپ اپنی صلاحیتیں مفید کاموں میں استعمال کریں۔

معترض حضرات سے گذارش ہے کہ مفتی صاحب کے جس عقیدہ یا عمل سے انہیں اختلاف ہو ، اس کی حقیقت جاننے کے لیے مرکزی دفتر خدام اھل السنۃ والجماعۃ سے رجوع فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اہل سنت والجماعت کے موقف پر استقامت اور تمام اہل بدعت سے نفرت پر قائم رکھے۔آمین.

وصلی اللّٰہ علی خیر خلقه سید نا محمد وعلی اله واصحابه اجمعین.

درحقیقت یہ پابندی ہی سب سے بڑی پابندی تھی جس کی وجہ سے محترمی جناب زاہد حسین رشیدی صاحب مدظلہم کا گرامی نامہ تشنۂ جواب رہا۔ یا تو جماعت تحریک خدام اھل السنۃ والجماعۃ میں شمولیت ہی نہ اختیار کی ہوتی اور جب 2008ء میں باقاعدہ جماعت سے وابستگی اختیار کر لی گئی تو

اب یہ اختیار ہی کہاں باقی رہ گیا تھا کہ حضرۃ الامیر دامت برکاتھم کے احکامات کی پابندی نہ کی جائے۔ بڑی بڑی دینی جماعتیں، جن کا حلقۂ اثر پوری دنیا میں تھا، ان کے تباہ و برباد ہو جانے اور جگ ہنسائی کا سبب بننے کی، دیگر وجوہ میں سے ایک وجہ، امیر جماعت کے احکامات کی خلاف ورزی بھی تھی اس لیے یا تو یہ صاف اعلان کیا جاتا کہ تحریک خدام اھل السنۃ والجماعۃ کے قواعد و اصول ماننے سے انکار ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی شر انگیز بغاوت و سرکشی کی روش سے محفوظ اور حضرات اھل السنۃ والجماعۃ ہی سے دنیا و آخرت میں انتساب اور لاج کی پردہ داری فرمائے اور یا پھر یہ تھا کہ سر تسلیم خم رہے اور یہی ہوا۔ حضرۃ الامیر دامت برکاتھم نے فرمایا کہ ہم سب ایک ہی جماعت کے کارکن ہیں اور وہ مولانا عبدالجبار سلفی صاحب مدظلہم سے بھی بات کریں گے اور جواب نہ تحریر کیا جائے کہ یہ سوال و جواب اور جوابی تحریرات بسا اوقات فتنے کی بنیاد بن جاتے ہیں۔

گرامی نامہ موصول ہونے کی اطلاع اور ان حضرات کا یہ مؤقف کہ خاموشی اختیار کی جائے، فون پر مخدومی جناب مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب مدظلہم کی خدمت میں عرض کیا تو ان کا اصرار یہ تھا کہ اس بات کی وضاحت ہونی چاہیے۔ ضرور لکھئے۔

حضرت الامیر دامت برکاتھم نے محترمی جناب عبدالجبار سلفی صاحب سے بات تو کی لیکن یہ علم نہیں کہ کیا بات ہوئی۔ جناب مولانا عبدالجبار سلفی صاحب دامت برکاتھم سے فون پر دریافت کیا گیا کہ آپ نے جس خط کو تحریر کرنے کا وعدہ فرمایا تھا، اُس کا کیا بنا؟ تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ خط لکھ دیا گیا ہے لیکن ترسیل باقی ہے۔ یہاں بے چینی سے اُن کے خط کا انتظار ہی رہا لیکن ہوا یہ کہ اُن کے والد محترم بیمار ہو گئے اور اپنے گھر کی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے وہ اپنے اُس خط کی ایک عدد کاپی ہمیں ارسال نہ کر سکے اور شاید آنمخدوم جناب مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب دامت برکاتھم کو بھی ان کا گرامی نامہ نہ ملا ہو گا۔ مکرمی جناب شبیر احمد خان میواتی صاحب بھی اسی دوران مسلسل رابطے

میں رہے لیکن اس طرف نہ لکھنے اور خاموشی کی پابندی ضروری تھی اور ادھر تقاضائے جواب تھا کہ آنمحترم جناب مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب دامت برکاتہم کا تیسرا گرامی نامہ موصول ہوا۔

دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ　　　اس کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں

جواب نہ لکھنے کا قلق تھا لیکن یہ داغ نہاں دیکھنے کا دستور، دستورِ زمانہ نہیں ہے۔

لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکہ　　　ہر روز دکھاتا ہوں میں ایک داغ نہاں اور

جو تیسرا گرامی نامہ موصول ہوا وہ یہ تھا۔

اصل کلمہ اسلام لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
یا اللہ　　حق چار یار
بچیوں کی تعلیم وتربیت کی مثالی وقدیم درسگاہ
جامعہ اہل سنت تعلیم النساء چکوال (رجسٹرڈ)

گرامی قدر حضرت مفتی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماہنامہ الحامد نومبر ۲۰۱۱ء موصول ہوا۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء
ابتدائی سطور میں آنجناب نے بالکل بجا لکھا ہے:۔
"مسلمہ قاعدہ ہے کہ ہر انسان کی زبان سے زیادہ
اس کی تحریر قابل اطمینان ہوتی ہے"
شاید اسی بنیاد پر راقم کی گذارش تھی کہ مجلہ ترجمان دار العلوم میں
اپنے کوڈ شدہ الفاظ کی آنجناب اپنے قلم سے وضاحت فرما دیں گے
تو ریکارڈ درست ہو جائے گا اور شکوک وشبہات کے بادل چھٹ جائیں
گے۔ بصورت دیگر آپ کی طرف سے کسی تردید کا نہ آنا مروجہ اصولوں
کی بنیاد پر آپ کی تائید تصور ہوگا۔
ارشاد کے مطابق سلفی صاحب سے بات کی تھی انہیں آپ نے اپنی وضاحت کا
حوالہ دیا؟ بتایا وہ اس پر مطمئن نہ تھے۔ نفس وضاحت پر انہیں یا کسی
بزرگ کو کیا اشکال ہو سکتا ہے؟ والسلام

نیاز مند
زاہد حسین رشیدی
۱۴ دسمبر ۲۰۱۱ء

بانی قائد اہل سنت وکیل صحابہ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین ؒ ۔ عقب مدنی جامع مسجد چکوال
Tel: 0543-554566 Fax: 0543-550860 Mob: 0300-9470582 E-mail: haqcharyar2000@yahoo.com

اب کے گرامی نامے کی زبان عتاب نامے کی تھی۔ محترمی جناب مولانا عبدالجبار سلفی صاحب دامت برکاتہم نے کیا وضاحت کی؟ خاکہ کیا تھا؟ کچھ معلوم نہیں البتہ جناب محترم مولانا رشیدی صاحب دامت برکاتہم کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ خاموشی بے سبب نہیں ہے لیکن اس گرامی نامے کی زبان کہہ رہی تھی کہ محبت بھری خفگی اور ظہور عتاب ہے۔

أعـاتب ذا لـمودة من صديق　　اذا مـا را بـنـى منـه اجتنـاب
إذا ذهـب الـعتـاب فليس ود　　ويـبقـى الـود مـا بقي العتاب

دسمبر کے اواخر میں یہ موصول ہوا اور اسے پڑھ کر محترمی جناب مولانا عبدالجبار سلفی صاحب دامت برکاتہم سے ایسا احتجاج کیا جو بآواز بلند بھی تھا اور بے ادبی کی حدود کو بھی چھو رہا تھا کہ جب ایسا لکھا جار ہا ہے تو انہیں یا تو جواب ملنا چاہیے اور یا پھر یہ ذمہ داری ہی نہیں لی جانی چاہیے تھی کہ وضاحت ہو جائے گی۔

بظاہر کچھ اسباب ایسے مساعد تو نہ تھے لیکن فوری طور پر تقریباً پندرہ برس کے بعد اُمیدوں اور آرزوؤں کی سرزمین، ہندوستان کا ویزا مل گیا اور بات رہ گئی۔ سفر ہندوستان میں محترمی ومکرمی جناب وارث مظہری صاحب دام اقبالہ سے نیاز حاصل ہوئی لیکن ان کے اخلاق کریمانہ نے دہلی میں پہلی ملاقات اور پھر کھانے اور دعوت تک میں یہ موضوع تو درکنار، پر چھائیں تک نہیں پڑنے دیں۔ اور ادھر بھی پابندی مراسم رہی۔

جو منکر وفا ہو، فریب اس پہ کیا چلے　　کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

ہندوستان سے واپسی پر پہلا فون مولانا جمیل الرحمٰن عباسی صاحب دامت برکاتہم، جن کا مشن پاکستان میں عقائد اھل السنۃ والجماعۃ کا دفاع ہے اور یہ نوجوان عالم دین اپنے محاذ پر فاتح و کامران سپاہی ہے۔ دو ماہی ماہنامہ ''تسکین الصدور'' بہاولپور سے ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا رہتا ہے اور وہ گجرات سے نکلنے والے پرچے ماہنامہ ''صفدر'' کے بھی مدیر اعلیٰ ہیں (0301-7790908) ان کا فون آیا اور اطلاع ملی کہ مخدومی مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب دامت برکاتہم نے دارالعلوم دیوبند کی زمین کے قضیے کے معاملے میں ایک مضمون تحریر فرمایا ہے کیا اُس کو چھاپ دیا جائے یا یہ کہ اس معاملے میں کوئی وضاحت کر دی جائے گی؟ یہ بہت عمدہ اور اصولی

وہی موٗقف تھا، جسے ان سے پہلے مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب نے اپنایا تھا اور جو دنیا بھر میں اہل علم کے ہاں رسم ہے کہ جس شخص کے کلام یا تحریر کی وضاحت مطلوب ہوتو واضح کرنے کا پہلا حق اس کے متکلم یا مصنف کا ہے۔ بحمدہٖ سبحانہ وتعالیٰ ایسے مخلص اور سلجھے ہوئے حضرات سے بھی واسطہ پڑا۔ عرض کیا گیا کہ ان شاء اللہ مارچ کے شمارے الحامد میں یہ وضاحت چھاپ دی جائے گی آپ ذرا توقف فرمالیجیے۔

مخدومی جناب مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب سے بات ہوئی تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے اس مضمون کا روئے سخن آپ کی طرف نہیں ہے بلکہ ایک عمومی وضاحت تحریر کی ہے بات یہی ہو رہی تھی کہ مکرمی جناب شبیر احمد خان میواتی صاحب تشریف لے آئے اور انہوں نے اس معاملے میں خاصی دلچسپی اور مشکل کو سلجھانے میں بے لوث مدد کی ۔ بہت وقت صرف فرمایا اور مندرجہ ذیل وضاحت محترمی جناب مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب مدظلہم کے نام روانہ کر دی گئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلّہ ترجمان دارالعلوم کے مدیر محترم جناب وارث مظہری صاحب دام ظلہ کی پاکستان تشریف آوری 2011ء میں ہوئی تھی اور انہوں نے ہندوستان واپسی پر، اپنے اس دورۂ پاکستان کے تاثرات، اپنے موٗقر مجلّے ''ترجمان دارالعلوم'' میں تحریر فرمائے تھے۔ ان تاثرات میں انہوں نے ہماری گفتگو سے یہ جو تاثر لیا کہ دارالعلوم دیوبند کی پہلی تعمیر کے لیے اراضی، بانی دارالعلوم کو، انگریز حکومت نے عطا کی تھی، نہ صرف یہ بلکہ اس کی تاسیس میں انگریزی حکومت کے کارندے بھی شریک تھے ــــــ یہ تاثر یقیناً غلط فہمی پر مشتمل ہے ــــــ ہمارے الفاظ کی ادائیگی میں کوتاہی یا ان کے سمجھنے کی خطاء کا یقینی احتمال ہے۔ بلکہ احتمال کیا، واقعی غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔ وارث مظہری صاحب میرے لیے قابل احترام ہیں اور ان کے بارے میں کبھی میرے ذہن میں یہ بدگمانی پیدا نہیں ہوسکتی کہ انھوں نے قصداً میری گفتگو کو اس رنگ میں پیش کیا ہوگا۔ مجھے ہی زیادہ وضاحت سے بات کرنی چاہیے تھی تاکہ یہ غلط فہمی پیدا نہ

ہوتی۔ تاریخ کا ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم بھی دارالعلوم اور اُس کے اکابر کے متعلق ایسی غیر ذمہ دارانہ بات نہیں کہہ سکتا۔ دارالعلوم دیوبند کی تعمیر جن اراضی پر ہوئی وہ ہمارے بزرگوں کی محنت اور عوامی چندے کا نتیجہ تھا۔ اللہ تعالیٰ سبھی معاونین، مرحومین کو اپنی رضا اور قرب سے نوازے۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام میں انگریز حکومت کے کسی فرد یا اُن کی حکومت کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے تو بالکل جھوٹ کہتا ہے۔ تاریخ کے ادنیٰ طالب علم ہونے کے ناطے ہم یہ گفتگو کیسے کر سکتے تھے؟ اکابرین دیوبند رحمہم اللہ کی غیرت کا تو یہ حال تھا کہ صوبہ متحدہ کے گورنر، سر جیمس مسٹن نے یکم مارچ 1915ء بمطابق 1322ھ میں جب دارالعلوم دیوبند کا معائنہ کیا تھا تو اس کی یہ ہمت نہیں ہو سکی تھی کہ وہ سرکاری مدد تک کی کوئی پیش کش کر سکتا۔ وہ چاہتا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کی مدد کرے لیکن اکابرین دارالعلوم رحمہم اللہ کی غیرت کے سبب یہ بات زبان تک پر نہیں لا سکتا تھا، چنانچہ اس نے صرف یہ کہا:

اس موقع پر میں خود تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کسی دنیوی طریقے سے آپ کی امداد و اعانت کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ یہ شاید آپ کو ناگوار گذرے............

(مکمل تاریخ دارالعلوم دیوبند، از: سید محبوب رضوی صاحب مرحوم، ج:۱، ص:۲۴۴)

نجی گفتگو میں کہنے، سننے، سمجھنے اور پھر اس گفتگو سے نتائج اخذ کرنے ان چاروں مراحل میں خطاء کا احتمال بہر حال ہوا کرتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی پہلی تعمیر کے متعلق اگر ہماری اس گفتگو سے یہ تاثر ملا ہے کہ وہ انگریز حکومت کی عنایات تھیں تو نہ صرف یہ کہ ہم اِس تاثر کی مکمل طور پر تردید کرتے ہیں بلکہ جن جن حضرات کو اِس بات سے ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑا اُن سے بھی اور اللہ تعالیٰ سے بھی معافی کے خواستگار ہیں۔ ہماری اس وضاحت کے بعد اُمید ہے کہ اہل علم کی غلط فہمی دھل جائے گی۔

محمد سعید خان

24-02-2012

یہی وضاحت مخدومی ومکرمی جناب مولانا نعیم الدین صاحب مدظلہم کو بھی ارسال کردی گئی اورانہوں نے فرمایا کہ اب مزید کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ۔ان شاء اللہ یہ وضاحت کافی ہے۔ جناب محترم میواتی صاحب کا بھی یہی مؤقف تھا اور انہوں نے اطلاع دی کہ مخدومی جناب مولانا زاہدحسین رشیدی صاحب مدظلہم نے بھی جن جن رسائل کو اپنا مضمون ارسال فرمایا تھا انہیں فون کر کے اشاعت سے منع کردیا ہے۔یہی جواب مولانا عبدالوحید حنفی صاحب مدظلہم کو دفتر تحریک خدام اھل السنۃ والجماعۃ کو بھی ارسال کردیا گیا اور انہوں نے ملاقات پر بہت خوشی اوراطمینان کا اظہار فرمایا کہ اتنی وضاحت بھی کافی ہے اور بظاہر یہ معاملہ نمٹ گیا۔

لیکن ایسے ہوانہیں۔

ے یکے حرف بود کاش کہ صد جا نوشتہ ایم

محترمی ومکرمی جناب عبدالوحید اشرفی صاحب نے اپنے رسالے ''فقاہت'' مارچ 2012ء میں مکالمہ ومذاکرہ کے عنوان سے مخدومی جناب مولانا حافظ زاہدحسین رشیدی صاحب کا مضمون چھاپ دیا۔اب یا تو اس مضمون کو نہ چھاپنے کی اطلاع صاحب تحریر نہ دے سکے یا رسالہ فقاہت اس وقت تک پریس میں جاچکا تھا یا کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے۔لیکن یہ مضمون چھپنے کے بعد 11 مارچ 2012ء بروز اتوار چکوال دفتر تحریک خدام اھل السنۃ والجماعۃ میں حضرت الامیر جناب مولانا قاضی ظہور حسین صاحب مدظلہم نے طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگرچہ میں نے منع کیا تھا کہ ان فضول مباحث کے جوابات اور جواب الجواب وغیرہ سے اجتناب کیا جائے لیکن اس مضمون کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ اس کا جواب لکھنا چاہیے۔

بس یہ وجوہ تھیں کہ مخدومی جناب حافظ زاہدحسین رشیدی صاحب مدظلہم کے گرامی ناموں کو دیکھا کیے لیکن ارسال وضاحت کا عذر رفع نہ ہوسکا اور اب چونکہ کوئی عذر باقی نہیں رہا بلکہ اس تحریر کا اصل

سبب حضرت الامیر مدظلہم کا حکم ہی ہے، اس لیے یہ سطور محض اپنے دوستوں کی خلجان طبع دور کرنے کو قلمبند کی جارہی ہیں۔

اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ مخدومی جناب وارث مظہری صاحب، محترمی جناب غطریف ندوی صاحب، مکرمی جناب مولانا حافظ زاہد حسین رشیدی صاحب، جناب مولانا عبدالوحید اشرفی صاحب، محترمی ومکرمی جناب سجاد الٰہی صاحب، مخدومی جناب مولانا نعیم الدین صاحب، خدام اھل السنۃ والجماعۃ کے حضرات محترمین کو متنفر کردے گا یا کوئی غلط فہمی ہمیشہ کے لیے پیدا کردے گا تو یہ محض اس کی خام خیالی ہے یہ تمام حضرات جس عزت وقدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، وہ انہی کی بڑائی ہے اور یہاں سے بھی جو ہمیشہ ان کی سیادت ومحبت کا اعتراف کیا جاتا ہے، اس میں کمی کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔

نفس مسئلہ ہے کیا؟

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ　　　اتنے تو پیچ تیرے کاکل پیچاں میں نہیں

جس جس نے اس مسئلے پر کچھ تحریر فرمایا ہے، جب اس کی تنقیح کی جائے تو مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

① یہ بات کہ دارالعلوم دیوبند کی جو پہلی تعمیر ہوئی ہے اس کی اراضی حکومت برطانیہ نے عطا کی تھی۔

② دارالعلوم کی تاسیس میں انگریزی حکومت کے کارندے بھی شریک تھے۔

③ بشارت نامی ایک کتابچے کا حوالہ دیا جواُن (سعید) کے بقول خود دارالعلوم کی ابتدائی روئیدادوں میں شامل ہے۔

④ اپنی اس رائے پر اصرار

⑤ تاسیس دارالعلوم میں انگریزوں کی شرکت ایسی گالی ہے، جسے مسلک دیوبند کا کوئی باہوش اور

غیرت مند بیٹا برداشت نہیں کرسکتا۔

⑥ مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی مزعومہ شراب نوشی پر گفتگو چھیڑ دی، جس سے محترمی جناب وارث مظہری صاحب دام اقبالہ کو طبعی تکدر رہوا۔

اس کتھا کے جوابات حسب ترتیب کچھ تفصیلات کے ساتھ پیش خدمت ہیں کیونکہ بار بار تاکید اور حکم یہی دیا گیا ہے کہ جوابات مناسب تفصیلات کے ساتھ ہونے چاہییں۔

دیو بند کی بستی شاید ان قدیم ترین بستیوں میں سے ایک ہے جو طوفان حضرت سیدنا نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد ابتدائی دور میں آباد ہوئی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک قصبہ کا نام رنڑ کھنڈی ہے۔ رنڑ کے معنی ہیں ''جنگ'' اور کھنڈ کے معنی ''مقام'' یعنی وہ مقام جہاں پر جنگ ہوئی۔ ہندوؤں کی قدیم کتاب مہابھارت میں جس بڑی جنگ کا ذکر ملتا ہے وہ غالباً یہی مقام ہے۔ اکبر بادشاہ کی آئین اکبری میں بھی دیو بند کا ذکر ہے اور دیو بند کے صدیقی حضرات تو پچھلے آٹھ سو سال سے وہیں مقیم ہیں۔ اس مبارک بستی کے مشرق میں گنگا اور مغرب میں جمنا کا کنارا ہے اور بادشاہ شیر شاہ سوری نے جو شاہراہ سنار گاؤں، ڈھاکہ (بنگلہ دیش) کے قریب تک بنوائی تھی اس کی ایک شاخ بھی یہاں سے گذرتی ہے۔ ملحقہ نقشے سے اس بستی کا محل وقوع بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ تقریباً پندرہ برس قبل، جو متعدد مرتبہ دیو بند جانا ہوا تھا، اس وقت ان تمام مقامات کو بخوبی اور بغور مشاہدہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔

تلک آثارنا تدل علینا فانظروا بعدنا الی الآثار

یہ وہ نشانات ہیں جو ہمارے عروج کی نشاندہی کرتے ہیں سو دنیا سے ہمارے اُٹھ جانے کے بعد ان نشانات پر غور کرنا۔

اقامها الله و ادامها.
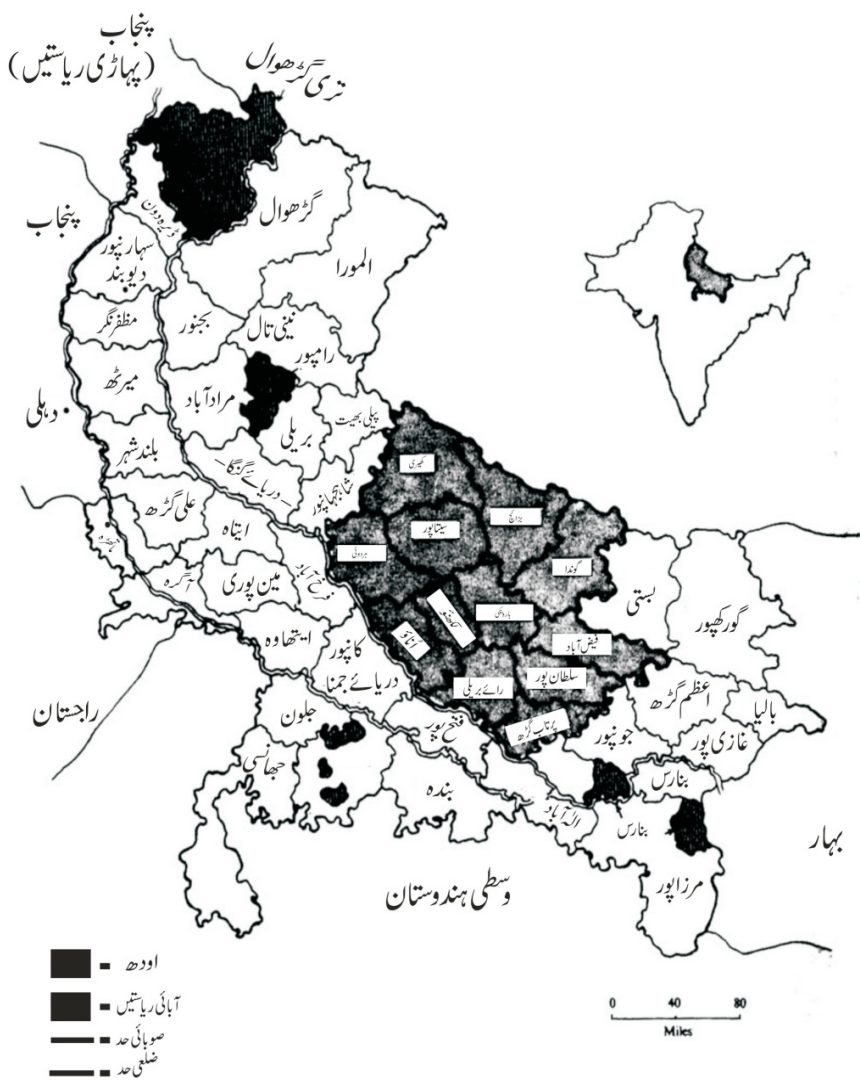
شمال مغربی صوبے اور اودھ (1904ء کے متحدہ صوبے)
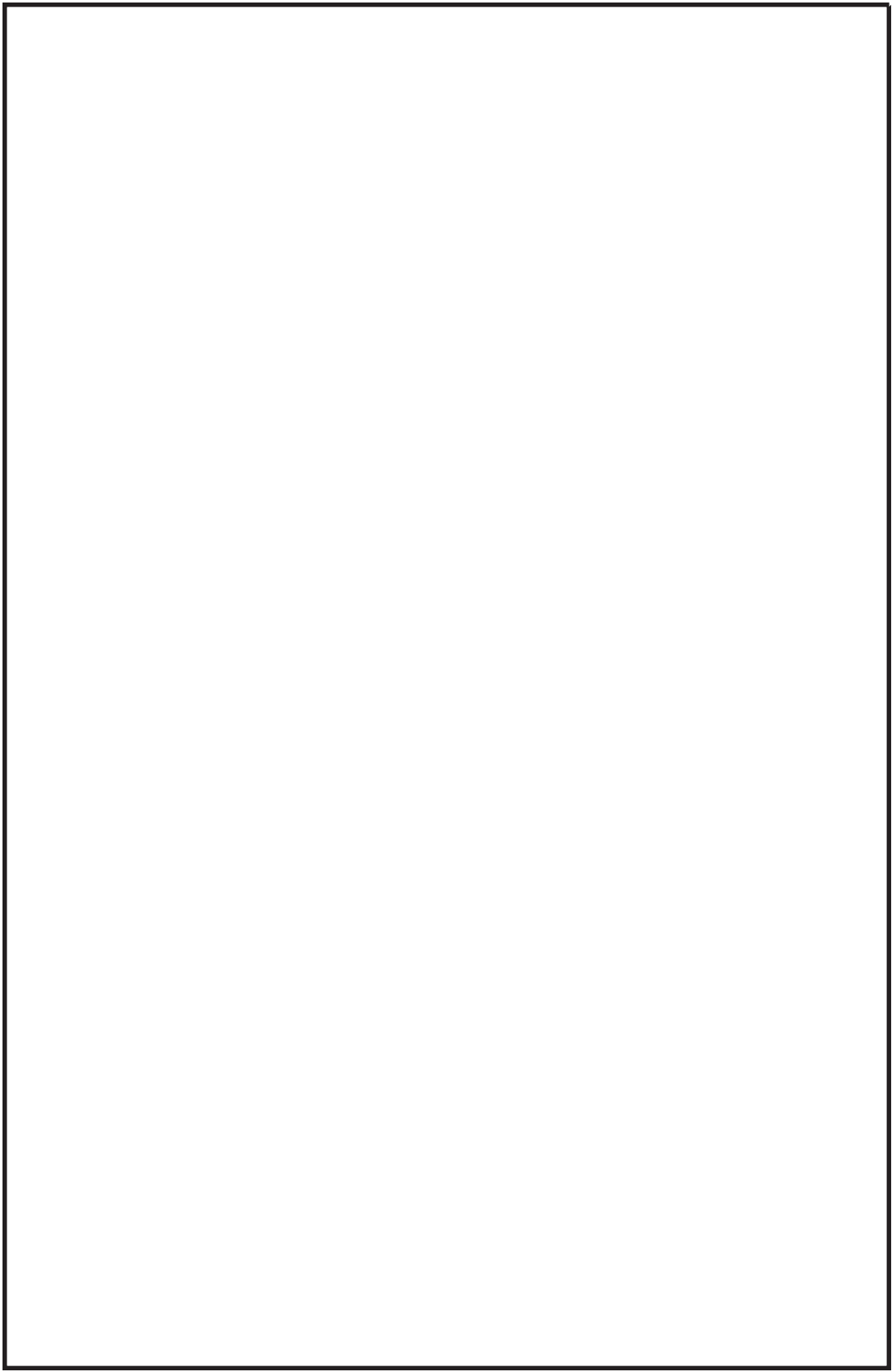
حضرت مرشدنا امیر المومنین سید احمد شہید نور اللہ مرقدہ نے ۱۲۳۴ھ میں دوآبہ کا دورہ فرمایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۲۳۳ھ میں دہلی میں صراط مستقیم کی ترتیب وتسوید سے آپ کے خلفاء گرامی رحمہم اللہ فارغ ہو چکے تھے۔ آپ دہلی سے چل کر غازی الدین نگر، مراد آباد، میرٹھ اور اس کے اردگرد کے مقامات، سرہند، بڈھانہ، پھلت، مظفر نگر، دیوبند اور اس کے گردونواح اور اس کے بعد سہارنپور تشریف لائے۔ یہاں پر آپ کی ملاقات سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے شیخ وقت اور سادات افغانستان میں سے معتبر زمانہ ہستی حضرت الشیخ عبدالرحیم صاحب ولایتی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی اور دونوں حضرات مشائخ کی باہمی نسبتوں کا اثر ہر دو پر پڑا۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت اقدس میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلسلۂ نقشبندیہ میں خلافت انہیں حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عنایت فرمائی۔

حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دونوں حضرات سے خلافت حاصل ہوئی اور وہ دو عظیم سلاسل سلسلہ چشتیہ صابریہ اور سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کا نقطہ اتصال تھے۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی اور حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ دونوں جہاد کے لیے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت میں چل پڑے اور بعد ازاں حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی رحمۃ اللہ علیہ کو تو جہاد کے لیے روک لیا اور حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو واپس ہندوستان بھیج دیا تاکہ وہ دیگر امور شرعیہ کی جدوجہد کریں۔

حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سن پیدائش ۱۲۰۱ھ ہے۔ وہ اپنے زمانے کے اکابر اولیاء کرام میں سے تھے صاحب کشف وکرامت اور فراست ایمانی سے بہرہ ور تھے۔ سن تو یاد نہیں لیکن دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین حضرت مولانا معراج الحق صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (از ۱۳۲۸ھ تا ۱۴۱۲ھ بمطابق از ۱۹۱۰ء تا ۱۹۹۱ء) ایک مرتبہ جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور تشریف لائے تھے۔ یہ

حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب نور اللہ مرقدہ کے ماموں تھے کہ ان کی ہمشیرہ صاحبہ کی شادی حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی تھی۔ دونوں حضرات مرحومین گھر کے اس دروازے سے باہر تشریف لا رہے تھے، جو کہ بیٹھک کی طرف کھلتا ہے اور مصروف گفتگو تھے۔ حضرت مولانا معراج الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اثناء گفتگو بس کھڑے کھڑے یہ جملہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ فرماتے تھے کہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ فقیر نے ایسی ہنڈیا پکائی ہے کہ نہ اس سے سو برس پہلے پکی تھی اور نہ اس کے سو برس بعد تک پکے گی۔ ان کے تشریف لے جانے کے بعد، حضرت نور اللہ مرقدہ سے استفسار کیا تھا کہ اس ہنڈیا سے کیا مراد ہے؟ اپنی عادت شریفہ کے مطابق آپ تکیے سے ٹیک لگا کر تشریف فرما تھے، سوچتے رہے اور فرمایا کہ صحیح بخاری شریف کے سبق میں حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ نے غالباً یہ ارشاد تو فرمایا تھا، کچھ ایسے یاد تو پڑتا ہے، پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد دارالعلوم دیوبند ہی ہوگا۔

حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کوئی معمولی آدمی نہ تھے متعدد اکابر سے سنا ہے کہ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ فرماتے تھے کہ ہندوستان میں دو جگہیں ایسی ہیں جہاں محسوس ہوتا ہے کہ یہ صاحب نسبت ہستی ابھی یہاں سے اٹھ کر کہیں تشریف لے گئی ہے اور ان میں سے ایک جگہ حضرت میاں جی نور اللہ مرقدہ کا حجرہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ نے جناب حضرت مولانا اسعد مدنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اسی حجرے میں ایک چلہ گزارنے کے لیے بھیجا تھا اور یہ بات حضرت مولانا اسعد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھار خود بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی دارالعلوم دیوبند عالم مثال میں ایک معلق ہنڈیا ہی کی صورت میں دکھایا گیا تھا۔ امر واقع یہ ہے کہ ان تمام اکابر رحمہم اللہ کا علم وتقویٰ کتاب وسنت سے حاصل کردہ تھا اور یہ حضرات منقولات کے ساتھ ساتھ معقولات کو بھی پڑھاتے تھے اور پھر منقولات

کو معقولات کے ساتھ گھول کر پیتے اور پلاتے تھے۔ جو نصاب وہ پڑھتے اور پڑھاتے تھے اس میں قاضی مبارک امہات المطالب تک، حمد اللہ شرطیات تک، صدرا صورت جسمیہ تک، شمس بازغہ مکان تک اور میبذی بھی مکمل شامل تھی۔ تو یہ حضرات منقولات کو معقولات کے درجے تک پہنچا دیتے تھے اور پھر شب وروز کے اذکار و مراقبات، ذکر خفی وجلی اور سلوک وتصوف کے مراحل طے کرتے کرتے ان معقولات کو محسوسات کے دائرے میں لے آتے تھے سو جو منقولات کو معقولات اور پھر معقولات کو محسوسات تک کے دائرے میں لے آتے تھے اُن کی عظمتوں کا کیا ٹھکانہ ہے۔

اگر کوئی شخص وجدانیات اور راہ سلوک سے صرف نظر کر کے دارالعلوم دیوبند کو سمجھنا یا اس کی تاریخ مرتب کرنا چاہے گا تو اس ڈور کا اصل سرا اس کے ہاتھ لگنے کا نہیں اور عقل ایسے امور میں کارآمد ہوا بھی نہیں کرتی کہ یہ میدان اس کے گھوڑے یہاں نہیں دوڑنے دیتا۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کی ''مثنوی زیر و بم'' اور مولانا عبدالکریم صاحب فروغ دیوبندی کی ''مثنوی فروغ'' کا مطالعہ کرنے سے بھی ایسے کچھ مسائل حل ہوتے ہیں۔

وہ جو ''ہنڈیا'' حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ومتعنی اللہ من روحہ وفیضہ نے پکائی تھی اور جسے حضرت اقدس نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو عالم کشف ومثال میں دکھایا گیا تھا اس کا وجود ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ بمطابق ۳۰ مئی 1866ء بروز جمعرات دیوبند نامی قصبے کی ایک مسجد، مسجد چھتہ کے صحن میں ایک انار کے درخت نیچے نہایت سادگی سے ظاہر ہوا، نہ کوئی زمین تھی، نہ کوئی قلعہ تھا صرف ایک مسجد میں انار کا درخت اور استاد ملا محمود رحمۃ اللہ علیہ جو کہ دیوبند ہی کے باشندے، میرٹھ کے ایک مدرسے میں مدرس تھے اور اب پندرہ روپے پر مدرس ہو کر اپنے اصل وطن دیوبند تشریف لے آئے تھے اور پہلا طالب علم بھی محمود نام کا بچہ تھا جسے آج دنیا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتی ہے۔ نور اللہ مضجعهما وطاب ثراهما.

اس سے پہلے ایک بہت بڑا سانحہ یہ پیش آ چکا تھا کہ حضرت مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا مدرسہ اُجڑ چکا تھا۔ حضرت اقدس شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش ۱۱۱۴ھ میں ہوئی تھی اور انتیس سال کی عمر میں انہوں نے اپنی زندگی کا پہلا فریضہ حج ۱۱۴۳ھ میں اور دوسرا حج ۱۱۴۴ھ میں ادا کر کے ۱۱۴۵ھ میں ہندوستان مراجعت فرمائی تھی۔ پرانی دلّی میں جو محلّہ اب مہندیان کہلاتا ہے، وہاں تدریس شروع کی تشنگان علم نے اس بحرالعلوم سے سیرابی حاصل کی اور طلباء کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ یہ جگہ کم پڑ گئی۔ بادشاہ وقت محمد شاہ رنگیلا (عہد حکمرانی ۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ) اگرچہ ہزار بدعمل سہی لیکن اس کی یہ نیکی کیا کم تھی کہ اس نے اپنے جدّ امجد شاہ جہاں بادشاہ کا وسیع وعریض پورا محل ــــ جو اَب کلاں محل کہلاتا ہےــــ اس جوان عالم دین کی نذر کر دیا۔ ہندوستان کے حالیہ سفر میں اس محل کو بار بار دیکھا۔ جہاں حضرت محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھایا، جہاں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر قرآن بیان کی جہاں اس شاہ ولی اللہی خاندان کا بہترین کتب خانہ تھا اور جہاں ایک مجذوب نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ مولوی صاحب کتنے صفحے پڑھے تو انہوں نے ارشاد فرمایا جتنی اس محل کی اینٹیں ہیں۔ اس نے دوسرا سوال کیا کہ اس تمام علم اور مطالعہ کا حاصل کیا نکلا؟ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ رو دیے۔ جہاں سے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کو نمو دملی، جہاں شاہ اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جدّی وراثت میں کوئی حصہ نہ بنتا تھا لیکن نانا نے مسند تدریس استوار کر کے حوالے کی جہاں حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید فی سبیل اللہ، قامع بدعت اور توحید ربانی کے علم بردار کا بچپن، تعلیم، تربیت اور تصنیف کے تمام مراحل طے ہوئے تھے، اس محل کلاں کو آج دیکھ کر جینے کی نئی قوت مل رہی تھی، ارادوں میں تقویت گھل رہی تھی اور آنکھوں نے اس دور کو سوچ کر غسل کیا، اس کلاں محل میں اعلائے کلمۃ اللہ کے داعی اگرچہ نگاہوں سے مستور تھے لیکن دل نے فوراً علامہ اقبال مرحوم کی بات سنی۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جُدا ہوتے نہیں
عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو
دامنِ دل بن گیا ہو رزم گاہِ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سُوئے منزل سفر
خضرِ ہمّت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر
وادیِ ہستی میں کوئی ہم سفر تک بھی نہ ہو
جادہ دِکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو
مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظُلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

بڑا سانحہ یہ ہوا کہ 1857ء کی بغاوت میں یہ مدرسہ اُجڑ گیا اور پھر ایسا اُجڑا کہ گویا چمن علم پر خزاں چھا گئی۔ میل ہا میل تک کوئی عالم دین ملنا دشوار ہو گیا کہ جنازہ پڑھا دے اور فتویٰ دینے کے اہل لوگ خال خال رہ گئے۔ انگریز حکومت نے اوقاف ضبط کر لیے اور مدارس تقریباً ختم ہو گئے۔ اہل اللہ کو فکر دامن گیر تھی کہ ہندوستان سے کہیں علم دین اُٹھ ہی نہ جائے۔ حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (پیدائش ۱۲۵۰ھ بمطابق ۱۸۳۴ء) جو دیوبند میں ورع و تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھے، اس صورتحال سے بہت پریشان تھے اور آخر کار انہوں نے فیصلہ فرمالیا کہ بہر صورت دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کرنا ہے۔ ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ بروز جمعہ بوقت اشراق انہوں نے اپنے سفید رومال کو دو طرف سے گرہیں لگائیں اور اپنی جیب سے تین روپے نکال کر اس جھولی میں ڈالے

اور قیام دارالعلوم دیوبند کے لیے یہ پہلا چندہ انہوں نے خود سے بارگاہ الٰہی میں پیش کیا اس وقت ان کا قیام چھتہ والی مسجد میں تھا۔ وہاں سے تن تنہا اُٹھے اور مولانا سید مہتاب علی صاحب مرحوم کے ہاں تشریف لے گئے اور اپنے ارادوں کا تذکرہ فرمایا انہوں نے چھ روپے چندہ دیا اور دارالعلوم دیوبند کے لیے یہ دوسرا چندہ تھا۔ وہاں سے اُٹھ کر وہ انہی مولانا سید مہتاب علی صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی مولانا سید ذوالفقار علی صاحب کے پاس آئے انہوں نے اپنے بھائی سے دُگنا چندہ یعنی بارہ روپے عنایت فرمائے۔ لاہور میں اسلامیہ ہائی سیکنڈری سکول کی جگہ پہلے انہی کی شاندار حویلی تھی۔ پھر ان کے بعد ان کے فرزند مولوی سید ممتاز علی صاحب مرحوم کا قیام بھی یہیں رہا وہ اُردو کا مشہور ماہنامہ ''تہذیب نسواں'' بھی نکالتے رہے پھر ان کے بعد ان کے بیٹے اُردو زبان کے مشہور ادیب سید امتیاز علی تاج صاحب تھے۔

۲ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ کو جب یہ واقعہ پیش آیا ہے تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند میں موجود نہیں تھے بلکہ میرٹھ میں ایک مکتبہ پر کام کرتے تھے۔ حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے نام، میرٹھ، ایک گرامی نامہ تحریر فرمایا کہ چندہ کی ایک مقدار جمع ہوگئی ہے آپ تشریف لائیے تو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رابطہ کیا (یہ دیوبند کے رہنے والے اور اس وقت میرٹھ میں پڑھا رہے تھے اور جید عالم دین تھے) اور اُن کی تنخواہ کے متعلق دریافت فرمایا تو انہیں اس وقت تنخواہ دس روپے مل رہی تھی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر آپ کی تنخواہ پندرہ روپے ہو جائے اور دیوبند ہی میں پڑھانا ہو تو کیسا ہے؟ انہوں نے اس پیش کش کو قبول فرمایا اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں دیوبند بھیج دیا اور حضرت حاجی عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ایک گرامی نامہ بھی لکھا کہ میں پندہ روپے ماہوار پر انہیں دیوبند بھیج رہا ہوں۔ آپ سلسلۂ تعلیم شروع فرمادیں اور میرا انتظار نہ کریں۔ میں بعد میں پہنچ جاؤں گا۔

چنانچہ چندہ جمع کرنے کے واقعے کے صرف ڈھائی ماہ بعد یعنی ۱۵ رمحرم ۱۲۸۳ھ میں چھتہ کی قدیم مسجد کے صحن میں ایک انار کے درخت تلے مولانا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تعلیم کا آغاز کیا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ پہلے شاگرد تھے اور یوں دار العلوم دیوبند کا افتتاح ہوا۔ یہ افتتاح مسجد چھتہ میں ہوا تھا اور اس وقت یہی مدرسہ تھا۔ موجودہ دار العلوم دیوبند نہ تھا اس لیے انگریزوں کا اس مسجد اور اس کی زمین سے کیسے کوئی تعلق ہوسکتا تھا؟ اس موقع پر جو اشتہار شائع ہوا تھا وہ اب تک دار العلوم کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ یہ جو دار العلوم کی بنیاد رکھنے جا رہے تھے ان حضرات کی عمریں کتنی تھیں؟ جب اس سوال کے جواب پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دار العلوم کا قیام بجز فضل الٰہی اور انعام خداوندی کے کچھ نہ تھا۔ حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر محض ۳۲ برس اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ان سے صرف دو برس بڑے یعنی ۳۴ برس کے تھے۔ یہ جو اپنی جوانی کے عروج اور اوج شباب پر تھے، معلوم ایسے ہوتا ہے کہ محض انتخاب الٰہی تھے ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء.

۱۲۸۴ھ میں جب اس دار العلوم کی عمر ایک برس تھی، دیوبند میں وبائی مرض (غالباً ہیضہ) بہت شدت سے پھیل گیا تھا۔ اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حاضریٔ حرمین شریفین کے لیے گئے تھے اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مہتمم بنا دیا گیا تھا۔ ۱۲۸۵ھ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ معائنے کے لیے تشریف لائے تھے اور ۱۲۸۶ھ میں دیوبند میں بخار کی وبا پھیل گئی تھی۔ حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حرمین شریفین سے تشریف لا چکے تھے اور وہ دوبارہ مہتمم ہوگئے تھے اور اب حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

دار العلوم ابھی تک مسجد چھتہ میں تھا اور طلباء کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی تھی ۱۲۸۸ھ میں طلباء کی تعداد ایک سو سے زائد ہوگئی تو اب دار العلوم کی دیوبند ہی میں (موجودہ دار العلوم کے قریب) قاضی مسجد کے قریب ایک مکان کرائے پر لے کر اس میں منتقل کر دیا گیا اور جب یہ مکان بھی ناکافی ثابت ہوا

تو ۱۲۹۰ھ میں دار العلوم کو دیو بند کی جامع مسجد (جو مسلم فنڈ کے قریب ہے) میں منتقل کر دیا گیا۔ اس جامع مسجد میں طلباء کے لیے حجرے اور دالان بنانے کی غرض سے چندے کی اپیل بھی ہوئی تھی اور ان حجروں اور دالان کو تعمیر بھی کیا گیا تھا۔ دیو بند میں یہ تینوں مساجد ① مسجد چھتہ ② مسجد قاضی ③ جامع مسجد دیو بند اب تک قائم، معروف اور معمور ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو جو کچھ عالم مثال وخواب میں دکھا گیا تھا، وہ سمجھ چکے تھے کہ اب ان تمام حقائق کے شرمندۂ تعبیر کا مرحلہ آ گیا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ دار العلوم کے فضلاء کتاب وسنت کے ساتھ ریاضی (Mathematics) جیومیٹری (Geometry) جسے اس دور میں علم ہندسہ کہا جاتا تھا، ہیئت (Morphology) فلکیات (Cosmology)، الٰہیات (Metaphysics) الجبرا (Algebra) جسے اس زمانے میں جبر ومقابلہ کہا جاتا تھا، مساحت (Mensuration)، اقلیدس (Eculids Elements) تعمیر ونقشہ سازی (Civil Engineering And Architetc) اور طب یونانی بھی پڑھیں۔ بلکہ امر واقع یہ ہے کہ اس دور کے دار العلوم میں یہ علوم پڑھائے بھی جاتے تھے۔ اس وقت ہندوستان میں طریقہ علاج طب یونانی تھا اور انگریزی طریقہ علاج (Allopathy) مشہور ومقبول نہیں ہوا تھا، اس لیے طب یونانی کی کتابیں، قانونچہ، اقصرائی، شرح اسباب، نفیسی، سدیدی، کلیات قانون شیخ بوعلی سینا اور حمیات قانون پڑھائی جاتی تھیں۔ اور ارباب مدرسہ نے عوام سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ وہ چندہ میں تعاون کریں تا کہ دار العلوم میں فن دوا سازی (Pharmacology) کا شعبہ بھی کھولا جائے اور اگر چندہ زیادہ ہو جائے تو پھر وافر مقدار میں جراحی کے آلات (Surgical Instruments) بھی خریدے جائیں اور فضلائے دار العلوم عالم اور مولوی ہونے کے ساتھ ساتھ سرجن ڈاکٹر بھی ہوں۔ دار العلوم میں یہ سب کچھ

پڑھایا جاتا تھا اور یا پھر بعض مضامین کو پڑھانے کی تیاریاں تو مکمل طور پر ہو چکی تھیں لیکن سرمایے کی قلت آڑ بن گئی تھی ۔ علامہ رشید رضا مصری صاحب تفسیر المنار آج سے ٹھیک ایک صدی پہلے 15 اپریل 1912ء میں جامعۃ الازہر مصر سے دارالعلوم تشریف لائے تھے تو انہوں نے فلسفہ کی کتابوں کے متعلق پوچھا کہ دارالعلوم میں کون سی کتابیں پڑھائی جارہی ہیں تو ارباب دارالعلوم نے بتایا کہ ''النقش فی الحجر'' نامی کتاب نصابِ فلسفہ دارالعلوم میں پڑھائی جاتی ہے تو وہ بہت خوش ہوئے لیکن فرمایا کہ میں اس سے بھی بہتر کتابیں آپ کو بتاؤں گا وہ پڑھایئے ، زیادہ مفید ثابت ہوں گی ۔

یہ کتاب ''النقش فی الحجر'' کیا تھی اس کے مندرجات پر ایک نظر دوڑا لیجیے ۔

حصہ	عربی	اردو	English
حصہ اول:	مبادی عامہ فی الطبعیات	طبعیات کے ابتدائی اصول	Elementry Principles of Physics
حصہ ثانی:	الکیمیاء	کیمسٹری	CHEMISTRY
حصہ ثالث:	الطبعیات	طبعیات	PHYSICS
حصہ رابع:	الجغرافیہ الطبعیہ	جغرافیۂ طبعی	PHYSICAL GEOGRAPAHY
حصہ خامس:	الجیولوجیا	علم طبقات ارض	GEOLOGY
حصہ سادس:	الھیئۃ	ہیئت / فلکیات	COSMOLOGY &ASTRONOMY
حصہ سابع:	علم النباتات	نباتات	BOTANY
حصہ ثامن:	اصول المنطق	اصول منطق	PRINCIPLES OF LOGIC

فتاویٰ رضویہ میں جناب احمد رضا خان جو ہمیں فزکس ، کیمسٹری ، جیالوجی اور متعدد موجودہ دنیوی علوم پر بحث کرتے ہوئے ملتے ہیں تو ان کی تمام معلومات کا اصل منبع یہی نصاب اور اس سے متعلقہ کتابیں ہی تو ہیں ، جو انہوں نے نہایت عرق ریزی سے پڑھی تھیں ۔ ان کا اور ہمارا مسلکی اختلاف اپنے مقام پر لیکن

کیا قرآن ہمیں یہ تعلیم نہیں دیتا کہ اگر کوئی خوبی دشمن میں بھی ہو تو اس کا اعتراف کرنا چاہیے۔

وَلَا يَجْرِ مَنَّكُمْ شَنَانُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا	اور کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے
هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى.	کہ تم انصاف نہ کرو تم سب انصاف سے کام لو، اور
(پ:٦، سورة المائده، آيت:٨)	یہی طرزِ عمل تقویٰ سے قریب تر ہے۔

جناب احمد رضا خان صاحب کی اس خوبی کا اعتراف یا انکار کرنے کا حق صرف اسی شخص کو پہنچتا ہے، جس نے ان کے فتاویٰ رضویہ کی تیس (30) جلدوں کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ کیا ہو۔ دیوبندی مکتبہ فکر تو کیا، بریلوی حضرات جو انہیں اپنا امام اور مجددِ دوران مانتے ہیں، ان میں سے بھی، عوام تو ایک طرف رہے، مفتی حضرات بھی شاید چند ایک ہی ملیں گے جو صدق و عدل کے دامن کو تھام کر یہ اعتراف کر سکیں کہ انہوں نے فتاویٰ رضویہ کا مکمل مطالعہ کیا ہے۔ [١]

---

١ لیکن جناب احمد رضا خان صاحب کی کتابوں اور خاص طور پر ان کے فتاویٰ کو پڑھ کر دماغ میں ہمیشہ یہ سوال اُٹھا کیا کہ جس کثرت سے جناب احمد رضا خان صاحب کتابوں پر کتابوں کے حوالے دیے چلے جاتے ہیں آخر ان کے پاس یہ کتابیں تھیں کہاں؟ اگر اُن کا ذاتی کتب خانہ واقعی اتنی کتابوں اور مخطوطات سے بھرپور ہوتا تو جگ میں دھوم مچ جاتی۔ یا پھر اُن کے آبائی شہر بریلی میں اتنا بڑا کتب خانہ تھا؟ یا بریلی کے محلے کتب خانے میں اتنی کتابیں تھیں کہ اُن کے زیر مطالعہ رہتی تھیں؟ ان کا انتقال صرف ۹۰ برس پہلے ۱۹۲۱ء ہی میں تو ہوا۔ وہ کوئی زیادہ قدیم دور کی گذری ہوئی شخصیت بھی نہیں ہیں کہ تحقیق مشکل سے ہو سکے پھر اُن کے کتب خانے کا کوئی سراغ کیوں نہیں ملتا؟ ممکن ہے کہ اس سوال کا کوئی جواب ہو اور ہمارے مطالعہ میں نہ آیا ہو۔ اُمید ہے کہ بریلوی مکتبہ فکر کے علماء کرام اس سوال کا کوئی تسلی بخش اور مستند جواب تحریر فرما سکیں گے۔

یہ کتاب ''النقش فی الحجر'' جو کہ دارالعلوم کے نصاب میں شامل تھی، ① معلوم ہے کس نے لکھی تھی، امریکہ کا مشہور مستشرق عیسائی جس نے شام اور لبنان میں عیسائیت کی ترویج کے لیے بہت محنت کی تھی، بیروت کی امریکن یونیورسٹی کا بانی، متعصب پادری اور بائبل کا عربی مترجم کرنیلوس وی اے وان دیک (Cornelius V.A van Dyck) اس کتاب کا مصنف تھا۔

---

① مخدومی ومکرمی جناب حضرت مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی مدظلہم العالی ـــــ کہ اس وقت پوری دنیا میں ان جیسا دوسرا آدمی کوئی نہیں جس کی نظر حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تحریک حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ، دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور ہی پر نہیں بلکہ برصغیر کے تمام مدارس اور تحریکات پر ہو۔ وہ اپنے علم اور معلومات میں یکتائے زمانہ ہیں اور آئندہ زمانے میں ان جیسا کوئی دوسرا آئے، اُمید موہوم ہے اگرچہ باری تعالیٰ کی قدرت میں کس کو کلام ہے مگر ان جیسا درِّ عدن جب آئے گا تو دیکھیں گے۔ الندوہ لائبریری کے لیے باعث صد افتخار اور یہاں کا شرف ہے کہ وہ جب ۲۰۱۱ء میں اپنے قریبی عزیز جناب ڈاکٹر محمود غازی صاحب مرحوم کی تعزیت کے لیے تشریف لائے تھے، تو ان کا قیام اور تشریف آوری یہاں بھی رہی ـــ ان کے سہ ماہی مجلّہ ''احوال و آثار'' بابت محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۲۹ھ میں غالباً سہو کتابت کی بنا پر اس کتاب کا نام تین طرح سے آیا ہے ① النقش کالحجر ② النقش الحجر ③ النقش فی الحجر، جب کہ کتاب کا اصل نام ''النقش فی الحجر'' ہے۔ الندوہ لائبریری میں موجود نسخہ ۱۸۹۱ء کا ہے اور اس سے پہلے یہی نسخہ بیروت سے ۱۸۸۶ء میں بھی چھپا تھا۔

اس مجلّے میں اس کتاب کے مصنف کا نام بھی سہو کتابت کی وجہ سے (Cornelius Yandyce) چھپ گیا ہے جب کہ اس مستشرق پادری کا اصل نام (Cornelius V.A.Van Dyck) ہے۔ امریکن اورنٹیل سوسائٹی کی طرف سے جس ''جرنل'' کی اشاعت ۱۸۸۵ء میں کی گئی اس میں اِس مستشرق پادری کے متعلق لکھا ہے۔

The Butrus el-Bistani mentioned by Dr.Van Dyck is the same who compiled the Mohut el-Mohit, which is for the Arabic language what Webster's or Worcester's dictionary is for the English. He also wrote the Miftah, or Key, an Arabic grammar which is in common use ,

اکابرین دارالعلوم رحمہم اللہ انگریزی حکومت اور اس کی تہذیب وثقافت کے سب سے بڑے ناقد اور مخالف تھے لیکن ان کا پیمانہ شعور اس قدر بلند تھا کہ انگریزی ثقافت اور علوم وفنون میں فرق کرتے تھے۔ علوم وفنون کسی بھی قوم سے آئے ہوں وہ ان کی قدر کرتے تھے، استفادہ کرتے تھے اور اپنی آنے والی نسلوں کو اُن علوم سے مستفید ہونے کی سعی اور ترغیب دیتے تھے لیکن اسلام کے علاوہ ہر ثقافت اور تہذیب کے شدید، پہلے درجے کے مخالف تھے۔لیکن روایت فرق مراتب، اعتدال، انگریز کی سیاست سے نفرت لیکن ان کے علوم وفنون سے استفادہ، مدت ہوئی، دیوبندی مکتبہ فکر سے رخصت ہو چکی۔

اس تحریر کو پڑھنے والے کو اس انکشاف پر اگر اچنبھا ہو یا وہ ناراض ہوں تو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، بجائے غصہ کرنے اور ناراض ہونے کے انٹرنیٹ پر جا کر یہ کتاب ، اس کا مصنف ، علامہ رشید رضا

---

and bighly esteemed by every one. At his death which occurred quite recently, he was engaged in compilling an Encyclopedia in Arabic, of which several large 8vo volumes were already issued;but I do not know hot far down the alphabet he had reached. He also edited three periodicals, a daily, a weekly, and a monthly. He spoke English well, had a flourishing school, and was an esteemed and respected citizen of Beirfut.

(Journal of The American Oriental society. Vol 11(1885).pp:276-286

Article viii The Arabic Bible of Drs.Elismith and Cornelius V.A Van Dyck.

Published by American Oriental society.)

مصری صاحب کی تقریر، دارالعلوم دیوبند کی ۱۳۲۹ھ کی رپورٹ سب کا مطالعہ کر لیجیے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

سو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر یہ دارالعلوم تھا جو کہ علوم وفنون کا جامع تھا اور ان مقاصد علیا کے حصول کے لیے یہ مساعی تھوڑی پڑ گئی تھیں چنانچہ انہوں نے دارالعلوم کی بنیاد پڑ جانے سے جونواں سال ۱۹/ذی قعدہ ۱۲۹۱ھ بروز جمعہ آیا تو کامیاب ہونے والے طلباء کے جلسہ انعام میں دارالعلوم کی بڑی عمارت کے لیے چندے کی اپیل کی اور اپنے مبارک عزائم کا اظہار فرمایا۔

عطیات اور چندہ کے لیے حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی دیا گیا اور زمین کی بیع بھی حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہوئی وہ تمام بزرگ زر و زمین کی ہوس سے کوسوں دور اوران علائق دنیوی سے پاک تھے۔ دارالعلوم کی یہ زمین عوامی چندے کا نتیجہ تھی اس میں انگریزی حکومت کا ہاتھ نہ تھا اور نہ ہی اس کی تاسیس میں کوئی انگریز شامل تھا یہ تمام حقائق دارالعلوم کی اس زمانے کی سالانہ روئیدادوں اور ''تذکرۃ العابدین'' میں موجود ہیں۔ الغرض چندہ جمع ہونا شروع ہوا اور ٹھیک ایک سال ۱۲۹۲ھ تک رقم جمع ہوتی رہی یہاں تک کہ اسی سال کے آخر پر ۲ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ کو موجودہ دارالعلوم کی عمارت کی بنیاد کا حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی اینٹ رکھ کر آغاز فرمایا دوسری اینٹ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور تیسری اینٹ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی۔ باقاعدہ طور پر تعمیر کا آغاز ۱۲۹۳ھ میں ہوا۔ اور جو عمارت تعمیر ہوئی اس کے دو درجے ہیں اور ہر ایک درجے میں، نو، نو دروازے ہیں اس لیے یہ نو درہ کہلاتی ہے اور یہی وہ نقشہ ہے جو حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دکھایا گیا تھا۔ یہ عمارت مضمون کے ساتھ ملحقہ نقشے میں ملاحظہ ہو:
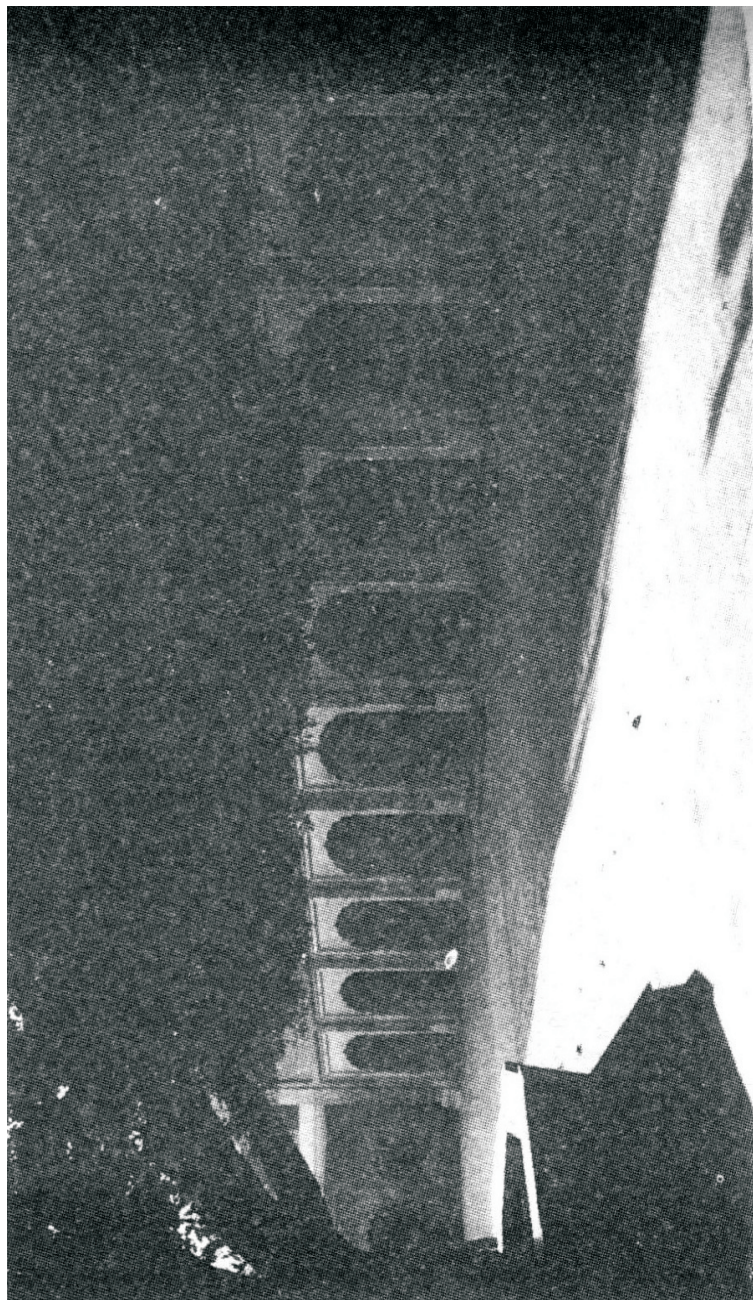
5. Naudarah, the first classroom building, completed in 1877

اس نودرہ کی زمین اور عمارت میں انگریزوں کا یا ان کی حکومت کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا۔ ان کے وہم وگمان میں بھی یہ نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس عمارت کو اتنی برکات اور دارالعلوم کو اتنی قبولیت سے نوازیں گے کہ چار دانگ عالم میں اس کا ڈنکا بجے گا۔

اس وقت تک تو دارالعلوم اپنے اس نام سے موسوم ہی نہیں تھا۔ صرف مدرسہ اسلامیہ عربیہ یا مدرسہ اسلامی عربی دیوبند کہلاتا تھا۔ یہ دارالعلوم کا لفظ تو پہلی مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے یکم صفر ۱۲۹۶ھ میں تقسیم جلسہ انعام کے موقع پر استعمال فرمایا تھا۔

یہ حضرات جہاں مسلمانان ہند کے لیے ایک دارالعلوم (یونیورسٹی) کا سنگ بنیاد رکھ رہے تھے وہاں ان کی نگاہ اُمت کے مجموعی مسائل پر بھی تھی خلافت عثمانیہ کی بقاء ان کے نزدیک اُمت کا سب سے بڑا مسئلہ تھا چنانچہ ترکوں کی زبوں حالی اور حوادث ومصائب کو اخبارات میں پڑھ کر ان حضرات نے اپنا فریضہ ادا کرنے میں کوتاہی نہیں برتی اور دارالعلوم نے پینسٹھ ہزار (65000) روپے کا گراں قدر عطیہ ترکی روانہ کیا۔

دارالعلوم میں سلسلۂ تعلیم بہت زور وشور سے جاری تھا اور یہ ضرورت دن بدن بڑھتی جارہی تھی کہ تعمیرات کے سلسلے کو مزید وسعت دی جائے۔ اس وسعت پذیری میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ گندہ اور برساتی نالا تھا جو کہ نودرہ کے عقب میں بہہ رہا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ اس نالے کو وہاں سے ہٹا دیا جائے تاکہ دارالعلوم کی تعمیرات کو مزید وسعت دی جاسکے۔

کوئی بھی تحریک یا ادارہ حکومت وقت کے ساتھ کیسے ہی اختلافات کیوں نہ رکھتا ہو، ملک کے انتظامی امور میں ان مخالفین کو بہرحال حکومت ہی سے مدد لینی پڑتی ہے۔ حکومت خواہ کافروں ہی کی کیوں نہ ہو اگر ادارے میں بجلی کا کنکشن مطلوب ہو تو انہی کافروں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور وہ کافروں

کی حکومت کیسی ہی ناپسندیدہ کیوں نہ ہو ریلوے، ہوائی جہاز، ڈاک، خرید وفروخت کے قوانین اور نجانے کتنے ہی انتظامی معاملات ایسے ہیں جن میں کیا موافق حکومت اور کیا مخالفین سبھی کو انتظامیہ سے رجوع کے بناں مسائل کا حل نہیں ملتا۔

صوبۂ متحدہ کے گورنر سر جیمس ڈگس لاٹوش ۱۳۲۲ھ بمطابق ۱۹۰۵ء میں دارالعلوم کے معائنے کے لیے آئے۔ ان کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا اور ایک نظم پڑھی گئی ہے۔ جس کا مطلع یہ تھا:

یہ دارالعلم شاہا یادگار مسلمین دیبن اس کا نام ہے جو رشک شہر طوس ہے

یہ پوری نظم دارالعلوم کے اسی سن کے ریکارڈ میں مل جائے گی۔

جنرل لاٹوش بہت شستہ اردو جانتے تھے جلسہ گاہ میں انہوں نے بھی دارالعلوم کی طرف سے دیئے گئے سپاس نامے کا جواب دیا اور ایک بات یہ بھی کہی

''مجھ سے ایک نالے کی بابت کہا گیا ہے۔ جو مدرسہ کے قریب سے گذرتا ہے میں اس پر غور کروں گا۔''

حکومت نے اس نالے کو دور کرنے کی منظوری دے دی (بعد ازاں یہ زمین دارالعلوم ہی میں شامل ہوگئی) لیکن اس کے باوجود اس نالے کو یہاں سے نہیں ہٹایا جاسکا کیونکہ اس منصوبے پر جو رقم اٹھتی تھی اس کا بندوبست نہیں ہوسکا تھا۔

ارباب دارالعلوم اس تگ ودو میں مصروف رہے کیونکہ صوبائی حکومت کی اجازت کے ساتھ ساتھ ان کی مدد کی بھی ضرورت تھی۔ آخر کار حضرت مہتمم دارالعلوم جناب مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۳۳۳ھ بمطابق ۱۹۱۵ء میں یہ فیصلہ فرمایا کہ صوبہ متحدہ کے گورنر صاحب کو دوبارہ دارالعلوم کے معائنے کے لیے مدعو کیا جائے اور پھر سے اس مسئلے کو ان کے سامنے رکھا جائے اس مرتبہ صوبہ متحدہ کے گورنر سر جیمس مسٹن تھے وہ یکم مارچ ۱۹۱۵ء کو دارالعلوم آئے اور یہاں کے نظام تعلیم،

اکابرین کے استغناء اور مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے نالے کا مسئلہ بھی حل کر دیا۔ رکاوٹ دور ہوئی دارالعلوم کی تعمیرات کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا۔ اور وہ اراضی دارالعلوم کا حصہ بنیں۔

اس واقعہ کو ''مکمل تاریخ دارالعلوم دیوبند''، زیرعنوان ① صوبہ متحدہ کے گورنر کا ورود، جلد اول، ص:۲۰۹ اور ② گورنر یو۔ پی کا ورود، جلد اول، ص:۲۴۱ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے ریکارڈ کی جو روئیداد ہر سال چھپتی تھی وہاں کے ریکارڈ میں ملاحظہ فرمالیا جائے۔ وہاں یہ سب کچھ درج ہے۔ اس تک بھی رسائی نہ ہو تو معلوم نہیں، جامعہ رشیدیہ ساہیوال کا ترجمان ایک شمارہ ''الرشید'' اب بھی چھپتا ہے یا نہیں؟ لیکن جب وہ چھپتا تھا تو اس نے اپنا ایک خاص نمبر ''تاریخ دارالعلوم دیوبند نمبر'' مارچ، اپریل ۱۹۸۰ء، آج سے ۳۲ برس قبل شائع کیا تھا، اسے پڑھ لینا چاہیے۔ وہاں بھی یہ تمام باتیں درج ہیں اور اگر کسی کی میزانِ ذوق مطالعہ پر ''الرشید'' پورا نہ اُترے تو دیوبند کے صدیقی خانوادے کی ایک مختصر تاریخ ''ذکر صادق'' کے عنوان سے چھپ چکی ہے، اس سے بھی کچھ حوالہ مل سکے گا۔

حضرت مخدومی مدیر مجلّہ ترجمان دارالعلوم سے جو کچھ بھی گفتگو ہوئی تھی وہ اسی نودرے کے پیچھے گندے نالے کی زمین کی بابت گفتگو تھی۔ اب اس کی ادائیگی میں کوئی تسامح ہوا یا سمجھنے میں کوئی تسامح ہوا ہو بہرحال اللہ تعالیٰ ہم سب سے درگزر فرمائے۔ اس سے پہلے بھی ایک معذرت لکھی جاچکی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں اب اس بحث کو ختم کر دینا چاہیے۔ محترمی جناب مولانا وارث مظہری صاحب دام اقبالہ اپنے آخری گرامی نامے میں اس معذرت نامے اور وضاحت نامے (جو اس مضمون سے پہلے تحریر کیا جاچکا ہے) کے متعلق کیسی اچھی بات تحریر فرمائی ہے کہ

اہل علم اور اصحاب سے میری ذاتی گزارش ہے کہ ان کو قبول فرماتے ہوئے قضیے کو ختم کر دیا

جائے تا کہ اتفاق واتحاد کی فضا بحال ہو اور ہماری صلاحیتیں اور وسائل اور اوقات دیگر زیادہ اہم دینی دعوتی اور اصلاحی کاموں کے لیے فارغ ہوں۔

یہ معذرت و وضاحت تو اپنے مخلص دوستوں محترمی جناب وارث مظہری صاحب، محترم جناب سجاد الٰہی صاحب، محترم جناب مولانا نعیم الدین صاحب، محترم جناب مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب، محترم جناب مولانا عبدالوحید اشرفی صاحب دامت فیوضھم کے لیے تحریر کی گئی ہے۔ جہاں تک ان لوگوں کا معاملہ ہے جو ہمارے محترم مولانا وارث مظہری صاحب کی تحریر کا پمفلٹ بنا کر ہر ہر جگہ تقسیم کر رہے ہیں ان سے کوئی سب سے پہلے یہ تو پوچھے کہ پچھلے بیس سال سے جسے تم مرزائی اور مرتد کہہ رہے تھے اس نے اسلام کب قبول کیا ہے؟ وہ مسلمان کب سے ہوا ہے؟ جب وہ ہمیشہ سے آپ کی نظر میں کافر رہا ہے تو وہ اگر دارالعلوم کے متعلق کوئی جھوٹ بول رہا ہے تو اس میں زیادہ سیخ پا ہونے کی کیا بات ہے؟

جب آپ لوگ اس شخص پر کفر اور ارتداد کے الزامات ثابت نہ کر سکے تو نیا جھوٹ اور الزام گھڑا کہ ہم اُس کو مرتد نہیں کہتے بلکہ یہ کہتے ہیں اس کا تعلق مرزائیوں سے ہے۔ لوگوں نے اس جھوٹے الزام کے بھی ثبوت مانگے، کھلے چیلنج لوگوں نے دیئے اور اب تک بھی اس جھوٹے الزام کا ثبوت نہ ملا بس یہی لکھا کر لائے ہیں کہ عمر بھر بغیر تحقیق کے الزامات اور جھوٹ گھڑتے رہنا اپنا پیشہ ہے، یہی دین کی خدمت ہے اور خوف خدا عنقا ہو گیا ہے۔

محترمی مولانا وارث مظہری صاحب کا رویہ پاکستانی علماء میں سے بہت سے حضرات کے لیے قابل عمل ہے دیکھیے ایک نوع کی اس غلط فہمی کی باوجود جب انہوں نے ''الندوہ'' شمارہ بابت دسمبر ۲۰۱۱ء اور ۲۰۱۲ء میں ایک مضمون ''اہل بدعت اور علم حدیث'' پڑھا تو مندرجہ ذیل گرامی نامہ تحریر فرمایا۔

مکرمی ومحترمی مفتی سعید احمد خان صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

خدا کرے مزاج بخیر ہو۔آپ سے یہاں ملاقات رہی اور خوب رہی تاہم تشنگی کا احساس اب بھی ہے۔خود آپ کی اپنی مصروفیات کی وجہ سے بھی یہ ممکن نہ ہوسکا کہ کم از کم دہلی کے بڑے اور مشہور علمی ودینی اداروں کی زیارت اوران سے منسلک ارباب علم وفکر سے آپ کی گفت وشنید ہوسکے۔دہلی میں علما اوراسکالرس کی آمد رہتی ہے۔لیکن آپ جیسے صاحب علم وقلم شخصیت کا ورود مسعود،علم ودعوت کے حلقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے اپنے اندر خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔خدا کرے جو کمی اس سفر میں رہ گئی ہے وہ آئندہ سفر میں پوری ہوجائے۔

آپ کے عطا کردہ الندوہ کے دونوں شماروں (دسمبر 2011 وجنوری 2012) کو میں ایک ہی نشست میں پڑھ گیا۔واللہ نہ تو اسلام آباد کی ملاقات میں اور نہ ہی ہندوستان کی پہلی ملاقات میں اس کا اندازہ ہوپایا تھا کہ آپ علم وتحقیق کا اتنا اعلا اور شاندار ذوق رکھتے ہیں۔''علم حدیث اور اہل بدعت'' کے موضوع پر آپ کا یہ مقالہ حدیث ،رجال اور تاریخ وتراجم پر آپ کی دقیق نگاہی اور وسعت مطالعہ کا شاہد عدل ہے۔آپ نے جس تفصیل اور محققانہ بصیرت مندی کے ساتھ موضوع کا احاطہ کیا ہے اس کی مثالیں کم ہوتی جارہی ہیں۔یہ موضوع بھی بذات خود نہایت اہمیت کا حامل ہے۔مجھے اپنے کم علمی اور محدود مطالعے کا مکمل اعتراف ہے کہ اس موضوع پر اب تک کوئی تحریر میرے مطالعے میں نہیں آئی تھی۔برصغیر ہند خصوصا پاکستان میں مختلف مکاتب فکر اور سماجی حلقوں کے درمیان نظریاتی کش مکش کے جلو میں تکفیر وتبدیع کی جو فضا قائم ہوگئی ہے،اس کے خاتمے کے لیے بھی اس طرح کی تحریروں کی شدید ضرورت ہے۔آپ نے علامہ ابن حجر کے تسامح پر جو گرفت کی ہے،وہ نکتہ کشا ہے۔اللہ آپ کو مزید اس طرح کی علمی کاوشوں کا حوصلہ عطا فرمائے۔

جیسا کہ میں نے تجویز آپ کے سامنے تجویز رکھی تھی ،بہتر ہوگا اگر آپ الندوہ کو آن لائن کر سکیں۔ یہ کام بہت زیادہ محنت کا طالب نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہم جیسے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے لوگوں کے لیے ایسے موقر علمی رسالے سے بھلا کس طرح استفادہ ممکن ہو سکے گا؟ فی الحال کم از کم یہ صورت نکالیں کہ رسالے کی PDF فائل بنا کر ہم جیسے لوگوں کو ای میل کروادیں۔ میں اہل علم کے حلقوں تک اسے پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ میرا مشورہ ہے کہ رسالے کو حتی الامکان مسلکی بحث ومباحثے سے دور رکھا جائے کہ اس کا حاصل اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اُمت کی صفوں میں مزید انتشار پیدا ہو اور جماعتی سطح پر عدم برداشت کے ماحول کو فروغ ملے۔ امام غزالی کی اصولی اور شمولی فکر جو انہوں نے فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ میں پیش کی ہے اسے عام کرنے کی ضرورت ہے۔ میں صرف تذکیر کے لیے کہہ رہا ہوں ورنہ آپ سے زیادہ اس سے کون واقف ہوگا؟

اللہ تعالی آپ کی کوششوں کو قبول فرمائے۔

وارث مظہری

مدیر ''ترجمان دارالعلوم''، نئی دہلی

محترمی ومخدومی جناب مولانا وارث مظہری صاحب نہ تو مشائخ وقت میں سے ہیں اور نہ ہی وہ معروف معنی میں کوئی پیر طریقت یا تزکیۂ وتصفیہ کے مدعی ہیں لیکن اختلاف واحترام کو جس طرح انہوں نے جمع فرمایا ہے، وہ بہرحال قابل تحسین ہے۔ اُن کے اخلاق کریمانہ کے بھروسے پہ یہ تحریر کیا جارہا ہے کہ اپنی طرف سے اور اُن کی طرف سے دارالعلوم دیوبند کی زمین کے متعلق یہ آخری تحریر درج کردی گئی ہے۔ گزارش ہے کہ اس قصے کو اب سمیٹ دیا جائے اور اپنا وقت اور صلاحیتیں جن کا جواب بہرحال اللہ تعالیٰ کو دینا ہے، مثبت کاموں میں استعمال کی جائیں۔

یہ تو وضاحت تھی پہلے دو سوالات کی کہ دارالعلوم کی زمین اور اس کی بنا میں انگریزوں کی شرکت ۔

③

''بشارت'' نامی جس تحریر کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ حوالہ اپنی جگہ پر قائم ہے ۔ حضرت اقدس مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے بعد کے دور مسعود کا ریکارڈ دیکھ لیا جائے ،تصدیق ہو جائے گی ۔ اصرار کی وجہ یہ رہی کہ بحمدہٖ سبحانہ وتعالیٰ دیوبند تین مرتبہ حاضری ہوئی اور جتنی مدت بھی قیام رہا صرف تین کام رہے ① اس وقت کے اُساتذہ و اکابر کی مجالس میں پابندی سے حاضری ② دارالعلوم کے کتب خانے سے استفادہ ③ دیوبند کے چپے چپے کو دیکھ کر تاریخی روایات کو ان کے مطابق تطبیق دینا۔ اس لیے ممکن ہے کہ حافظہ خطا کر رہا ہو مگر یہ حوالہ بھی مل جائے گا اور مزید وضاحت بھی ان شاء اللہ ہو جائے گی ۔ جناب مولانا سید محبوب رضوی صاحب نے ''بشارت'' کا ایک حوالہ ''مکمل تاریخ دارالعلوم دیوبند'' میں بھی دیا ہے ۔

آن راز کہ در سینہ نہاں است نہ واز است
بر دار تواں گفت بمنبر نتواں گفت

حوالے پر اصرار اس لیے بھی ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور اس سے متعلقہ اکابرین رحمہم اللہ کی مدح وقدح میں چاروں زبانوں ① اُردو ② فارسی ③ عربی ④ انگلش میں اتنا کچھ پڑھا ہے کہ ایک لاکھ صفحے بھی کہے جائیں تو مبالغہ نہ ہوگا ان حضرات سے جو اپنی نسبت ہے وہ یہ سب کچھ پڑھنے پڑھانے کے بعد ہی ہے اس میں کسی غباوت ، جہالت یا اندھی تقلید کی آمیزش نہیں ہے ۔ اپنے اکابر رحمہم اللہ سے محبت ہے ، اِن سے نسبت پر فخر ہے لیکن انہیں معصوم نہیں مانا کہ اهل السنة والجماعة کے نزدیک عصمت صرف لوازمات نبوت میں سے ہے، نہ لوازمات ولایت میں سے ۔ ان سب حضرات رحمہم اللہ کا تعلق شاہ ولی اللہی فکر، مجددی طرز اور آئمہ اهل السنة والجماعة کثر اللہ سوادہم سے واسطہ در واسطہ جڑا

ہوا ہے اور یہ تمام حضرات انہی وسائط کے ذریعے کتاب وسنت اور آئمہ مجتہدین رحمہم اللہ سے پیوست ہیں، بس یہی وجہ ہے کہ دل سے دعا ہے اللہ تعالیٰ زندگی میں انہی کے منہج پر قائم رکھے اور آخرت میں بھی ان کی معیت نصیب فرمائے۔

---

⑤

محترمی جناب مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب مدظلہم نے جو لفظ ''گالی'' تحریر فرمایا ہے اس وضاحتی مضمون کے بعد حقیقی صورتحال کی وضاحت ہو جائے گی اور وہ ہمیشہ کی طرح درجہ مخدومیت پر فائز رہ کر اپنے خدام پر شفقت فرماتے رہیں گے۔

لیکن اتنی سی بات کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ انہوں نے اپنے مضمون میں یہ جو شعر لکھا ہے:

خرد کا نام جنوں رکھ دیا اور جنوں کا خرد ے جو چاہے آپکا حسن کرشمہ ساز کرے

اور پھر اسے علامہ اقبال کا شعر بتایا ہے تو اس پر بے اختیار غالب کا ایک لطیفہ یاد آیا۔ مدت ہوئی پڑھا تھا اور غالباً حالی نے لکھا ہے کہ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کے زمانے میں ایک اور شاعر بھی تھے جن کا تخلص بھی اسد اللہ تھا کسی نے اُن اسد اللہ کا ایک نہایت گھٹیا شعر پڑھ کر اسد اللہ خان غالبؔ سے پوچھا کہ کیا یہ شعر آپ کا ہے؟ تو غالب بولے دیکھو بھئی اگر یہ شعر میرا ہو تو مجھ پر خدا کی لعنت اور اگر میرے علاوہ کسی اور اسد اللہ کا ہے تو اس پر خدا کی لعنت۔

میرے مخدوم نے جس شعر کو علامہ اقبال کی طرف منسوب کیا ہے، وہ بھلا ایسا شعر کب کہہ سکتے تھے؟ میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ، اسد اللہ خان غالبؔ، ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا حسرت موہانی، فیض احمد فیض اور احمد فراز مرحومین کو مدتوں پڑھا ہے۔ جب ان میں سے کسی کا شعر سنتے ہیں تو وہ خود بولتا ہے کہ مجھے کس نے کہا ہے حیرت ہے ہمارے مخدوم اتنا بھی نہ جان سکے کہ یہ شعر بھلا علامہ اقبال کیسے کہہ

سکتے تھے۔ اور پھر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ مخدومی یہ شعر تو وزن پر بھی پورا نہیں اُترتا یہ جو لفظ ''رکھ'' آیا ہے اس پر سکتہ پڑتا ہے مخدومی نے درس نظامی میں عروض تو پڑھے ہوں گے پھر یہ خیال کیوں نہ آیا کہ یہ شعر تو وزن سے ہی گرا ہوا ہے، بھلا یہ بھی کوئی لکھنے اور پھر اسے علامہ اقبال کی طرف منسوب کرنے کی بات تھی۔ اصل شعر یوں ہے:

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے — خرد کا نام جنوں پڑگیا، جنوں کا خرد

اور یہ شعر جناب والا علامہ اقبال مرحوم کا نہیں، مولانا سید فضل الحسن مرحوم کا ہے۔ ان کا دیوان تو مخدومی ومکرمی جناب مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب نے پڑھا ہی ہوگا۔ ان کی مشہور غزل جس کا مطلع

وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے — نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے

ہے، اسی کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

---

⑥

جہاں تک حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی مے نوشی کا تذکرہ ہے، مخدومی جناب مولانا وارث مظہری صاحب نے تو صرف یہ تحریر فرمایا ہے کہ ''انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی مزعومہ شراب نوشی پر گفتگو چھیڑ دی'' یہ تو نہیں تحریر فرمایا ''انہوں نے مولانا آزاد پر الزام لگایا'' اگر کوئی حضرت آزاد رحمۃ اللہ علیہ پر الزام لگاتا تو اس کی تردید کی جاتی اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی مدح بیان کی جاتی جب ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں تو پھر حضرت آزاد کی تعریف میں مضمون لکھنا، اس میں ضرور کوئی ایسی حکمت ہوگی جو نالائق خدام کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے رفتگان آب وگل کو بجز خیر کے اور کسی

طرح بھی یاد کرنے سے منع فرمایا ہے۔ بحمدہٖ سبحانہ وتعالیٰ یہ جو دن رات جھوٹ اور الزامات پر مبنی پمفلٹ چھاپ چھاپ کر تقسیم کر رہے ہیں، ان کی غیبت کبھی نہیں کی تو حضرت آزاد رحمۃ اللہ علیہ پر الزام لگانا تو تصور ہی سے بالا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کچھ بھی تھے بہرحال عالم دین تھے اور علماء کی شان میں ناشائستہ الفاظ استعمال کرنا اپنے آپ کو منافقین کی صف میں کھڑا کرنا ہے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ثلاثة لا یستخف بحقھم الا منافق بین النفاق ، ذوالشیبة فی الاسلام ، وذوالعلم و امام مقسط .

تین آدمیوں ① وہ جو مسلمان تھا اور اسلام ہی کی حالت میں وہ بوڑھا ہوگیا ② عالم دین ③ انصاف کرنے والا امام وقت کی بے عزتی تو صرف وہی شخص کرسکتا ہے جو کھلا ہوا منافق ہو۔

اور فقہ حنفی کی مشہور کتاب "مجمع الانھر" میں ہے:

من قال لعالم "عویلم" علی وجه الاستخفاف کفر.

جس شخص نے کسی عالم دین کی بے عزتی کرنے کے لیے یہ کہا ''اوئے مولوی'' تو یہ حرکت کفر کی ہے۔

خوب معلوم ہے کہ مولانا آزادؒ پر شراب نوشی کا الزام سب سے پہلے کس نے لگایا تھا پناہ بخدا جناب احمد رضا خان صاحب وغیرہ یہ حضرات ایسی تعریضات کیا کرتے تھے اسی لیے انہوں نے اپنے فتاویٰ ''فتاویٰ رضویہ'' میں یہ الفاظ تحریر فرمائے:

''خدا جانے مسٹر آزاد یہ کس جنگ یا کسی نشے کی ترنگ میں لکھ گئے''

(فتاویٰ رضویہ، رسالہ ''دوام العیش من الائمۃ من قریش''، مسئلہ:۲۴، ج:۱۴، ص:۱۷۷)

مے نوشی کے متعلق گفتگو کیسے اور کس نے شروع کی تھی، جناب ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی مدظلہم بھی اسی مجلس میں موجود تھے انہوں نے اپنے رسالے ''افکار ملی'' میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اسے بھی پڑھ لینا چاہیے تاکہ حقیقت مزید واضح ہو جائے۔

چائے کی نشست میں ہمارے میزبانوں کے ساتھ ہی ہم لوگوں سے خصوصی طور پر ملنے کے لیے آئے ایک صاحب جناب مفتی سعید احمد خاں نے دیوبند کے بارے میں بعض تاریخی انکشافات کیے مفتی صاحب خود بھی اکابر دیوبند کے عقیدت کیش ہیں۔ دیوبند سے آج جس طرح بعض لوگ طالبان کی فکر کو جوڑ رہے ہیں اس پس منظر میں مفتی صاحب کے انکشافات کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ اکابر دیوبند ایک وسیع نقطہ نظر کے حامل تھے۔ ابوالکلام آزادؒ کے بارے میں ان کی اور پروفیسر یسین مظہر صدیقی صاحب کی خوش گوار نوک جھونک بھی ہوتی رہی۔ مفتی سعید احمد خاں ایک وسیع المطالعہ، باخبر اور نہایت اثر ورسوخ والے آدمی ہیں۔ ساتھ ہی وہ ابوالکلامی بھی ہیں۔ جبکہ علی گڑھ کی یہ خصوصیت یا کمزوری ہے کہ وہ آزاد بیزار ہے۔ علی گڑھ میں آزاد شکنی کی ایک روایت رہی ہے۔ جس کی ابتدا بابائے اردو عبدالحق سے ہی ہو گئی تھی۔ علی گڑھ کے انگریزی زبان وادب کے ایک ماہر اسلوب احمد انصاری نے اپنی آزاد بیزاری کو تسکین ہی یوں دی ہے کہ وہ مستقل ابوالکلام آزاد کو مولوی آزاد لکھتے اور بولتے ہیں۔ اصل میں یہ ظرف کی بھی بات ہوتی ہے۔ علی گڑھ میں ہی ایک پروفیسر ہیں، عارف الاسلام، جنہوں نے ''اتاترک فی کربلا'' لکھی اور بزعم خویش آزاد کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ اور ثابت کیا ہے کہ سرسید کی فکر ہی صحیح تھی آزادؒ کی فکر صحیح نہ تھی۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ سرسیدؒ کی فکر پر خود علی گڑھ نے کب عمل کیا اور آزاد و سرسید میں تضاد کہاں ہے؟ راقم ان ساری شخصیات کا ادنی سا طالب علم ہے اور اس کی یہ شعوری رائے ہے کہ راست اور صحیح فکر آزادؒ ہی کی تھی۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ان کی ہر بات سے اتفاق ہی کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کا اس قدر دفاع کیا کہ ابوالکلامی کہلائے جب کہ تاثر اس سے اُلٹا دیا جا رہا ہے اور پورا مضمون لکھا گیا ہے کہ گویا اِدھر سے حضرت آزاد پر کوئی الزام لگایا گیا تھا اور ان کی توہین کی گئی تھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی شان میں ہمارا یہ مدحیہ مضمون جواب آن غزل ہے۔

جب اُس مجلس میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد پر لگنے والے الزامات کا دفاع بھی ہم نے کیا تھا جو جناب شورش اگر زندہ ہوتے تو ہمارے ہی مدح سرا ہوتے اس موقع پر جناب نواب مصطفیٰ خان صاحب شیفتہ مرحوم سخنور بھی کیا خوب یاد آئے۔

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں ، پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیب داستان کے لیے

ہمارے مخدوم جناب مولانا زاہد حسین رشیدی صاحب مدظلہم نے جو عتاب نامہ تحریر فرمایا تھا، اس سلسلے میں ہندوستان سے جناب ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی کی E.Mail بھی آئی ہے اور پھر انہوں نے فون پر یہ حکم بھی دیا کہ حضرت مخدوم رشیدی صاحب کے ملاحظہ سے یہ عریضہ بھی گذارا جائے۔ چنانچہ اُن کے حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔

محترم المقام جناب مولانا مفتی سعید احمد خاں صاحب
ایڈیٹر ماہنامہ الندوہ والحامد
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ ہندوستان تشریف لائے اور خود زحمت اٹھا کر جامعہ نگر آئے جس کے باعث آپ سے دوبار بالمشافہ گفتگو کا موقع ملا گرچہ تشنگی باقی رہی۔آپ کے عطا کردہ الندوہ کے دونوں شمارے بھی پورے پڑھے۔آپ کے مقالے علم حدیث پر خاصے کی چیز ہیں۔الحمدللہ تھوڑا سا شغف اللہ تعالی نے علم حدیث کا راقم کو بھی دیا ہے۔اس لیے راقم کو حضرت کشمیریؒ، شیخ ناصر الدین البانیؒ، شیخ عبد الفتاح ابوغدہؒ اور علامہ شبیر احمد میرٹھیؒ وغیرہم کی تحریرات سے خاص شغف ہے۔ بڑا شوق ہے شیخ الحدیث سرفراز خاں صفدرؒ کی تحقیقات پڑھنے کا۔فی الحال تو مکروہات دنیا نے ایسا گھیر رکھا ہے کہ وقت ہی نہیں ملتا ہے۔بہرحال، اصل میں عرض یہ کرنا ہے کہ چند دن پہلے بھائی وارث مظہری نے مجھے ایک میل بھیجا جس میں جناب حافظ

زاہد حسین رشیدی کی آپ کے اوپر تنقید ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علماء دیوبند کے بارے میں جو آپ نے ایک مبہم سی بات کہی تھی اس سے کسی کو غلط فہمی ہوسکتی تھی جواب آپ کی وضاحت کے بعد ختم ہوجانی چاہیے۔ مگر حافظ صاحب نے ابوالکلام آزادؒ کی مے نوشی کے قضیہ کو تو بالکل اُلٹا سمجھ لیا ہے۔ یہ بات تو اس مجلس میں موجود اہل علی گڑھ کی طرف سے کہی گئی تھی اور آپ نے تو ابوالکلام آزاد کا دفاع کیا تھا۔ معلوم نہیں حافظ صاحب نے وارث مظہری صاحب کے مضمون سے یہ نتیجہ کیسے نکال لیا۔

خیر! پاکستان کے سفر کے بعد راقم نے بھی اپنے تاثرات لکھے تھے جو پہلے تو دہلی سے نکلنے والے کئی اخبارات میں قسط وار شائع ہوئے۔ اس کے بعد ہندوستان کے ایک معروف ملی ماہنامہ ''افکار ملی'' دہلی میں بھی شائع ہوئے۔ میں یہ سفرنامہ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ میرے خیال میں آزادؒ کے بارے میں اس سے حافظ زاہد حسین رشیدی صاحب کے غلط تاثر کی نفی ہوجائے گی۔

والسلام

غطریف شہباز ندوی

فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی ۵۲

ہم سب کو یہ دعا مانگنی چاہیے

رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۔

(پ:۲۸، سورۃ الحشر، آیت : ۱۰)

اے ہمارے پروردگار ہماری خطاؤں سے بھی درگزر فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی غلطیوں سے بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے کوئی بغض نہ رکھ اے ہمارے پروردگار تو بہت شفیق اور بار بار رحم فرمانے والا ہے۔

⑦

مخدومی جناب وارث مظہری صاحب کے مضمون کو بنیاد بنا کر جو گروہ جھوٹے الزامات لگا رہا ہے اُن کی ماضی کی کارکردگی یہ ہے کہ جب گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے قتل کے موقع پر ایک بیان یہاں سے ریکارڈ کروایا گیا تھا (اور وہ اب تک ریکارڈ پر موجود ہے، جسے بہت سے مفتی حضرات نے سنا ہے۔) تو اُس بیان کو بنیاد بنا کر گستاخ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام قرار دیا گیا اور پنجاب کے شہر تلہ گنگ میں قتل کے فتوے جاری کیے گئے، جی چاہتا ہے کہ ان ''مشائخ کرام'' سے دو سوال پوچھے جائیں:

① یہ کہ جس شخص نے یہ گستاخی کی تھی وہ ابھی تک زندہ بلکہ یہ جواب لکھ رہا ہے اسے اب تک کیوں زندہ رہنے دیا جا رہا ہے؟ کہاں گئی وہ دُہائی کہ یہ شخص گستاخ رسول ہے اور وقتی طور پر عام جلسے میں لوگوں کو بیوقوف بنانے کی بھونڈی چال؟ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ وہ ''گستاخ'' اب تک زندہ ہے، آخر اس کا صفایا کیوں نہیں کر دیا گیا؟

اصل بات یہ ہے کہ پاکستان میں اسلام کے نام پر جو چند ایک جذباتی پیر اور مولوی لوگوں کو بیوقوف بنالیا کرتے تھے اب اس سحر کا اثر زائل ہو چکا، ان جذباتی باتوں سے اب کوئی نہ بیوقوف بنتا ہے اور نہ ہی کوئی جذبات میں اندھا ہو کر اِن جاہل اور جذباتی پیروں کے ڈراموں میں کوئی کردار ادا کرنے کو تیار ہے۔ آہستہ آہستہ لوگ انہی حضرات کی سادہ لوحی اور جذباتی باتوں کی وجہ سے دین سے ہی دور ہو گئے ہیں اور کوئی دن جاتا ہے کہ ان پنڈتوں کے سوانگ ختم ہوتے ہیں۔ وہی بات جو ریکارڈ کرائی گئی تھی بلکہ اس بیان سے بھی بڑھ کر جو فتویٰ جناب حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ گورمانی مدظلہم نے دیا ہے، وہ ہر جگہ چھپ گیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل میں علماء دیوبند کے یہی فتاویٰ موجود ہیں اور وہاں کا ریکارڈ ہر آدمی وہاں جا کر طلب کر سکتا ہے یا وہاں بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ سب حضرات قابل گردن زدنی کیوں نہیں؟ بات دارالعلوم کی زمین یا حضرت

رسالت مآب ﷺ کی عزت کی نہیں بلکہ اپنے جھوٹے الزامات کو کسی طرح سہارا دینا ہے اور جھوٹے دعووں کو باطل کی ٹیک لگانی ہے خود سے نہ پڑھنا نہ تعلیم ومطالعہ کا شغف اور نہ ٹھنڈا مزاج۔ کانوں کا کچا پن کہ ''حضرت والا'' کو جو کچھ کسی نے جا کر بتا دیا اور جو پٹی پڑھا دی بس اسی پر ایسے یقین کرلیا جیسے وحی نازل ہوگئی ہو اور یہ ذرا خیال نہ رہا کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا تھا:

كفى بالمرء كذبا أن يحدث بكل ما سمع. انسان کو جھوٹا بنا دینے کے لیے بس اتنی ہی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی کہانی بیان کرتا پھرے۔

---

⑧

ایک نیا یہ الزام کہ الندوہ لائبریری میں یہ کہا یا لکھا گیا ہے کہ ''نعرہ حیدری یا علیؓ'' کہنا درست ہے۔ گزارش یہ ہے کہ یہ فقرہ نہ کسی نے لکھا ہے اور نہ ہی ایسے کہا گیا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایک صاحب اس بات پر بضد تھے کہ ہر وہ شخص جو یا علی کا نعرہ لگاتا ہے، وہ کافر ہے۔ اِن سے عرض کیا گیا کہ کسی بھی مسلمان کی تکفیر اور خاص طور سے کسی بھی طبقے کی عمومی تکفیر نہایت ہی نازک مسئلہ ہے۔ اس معاملے میں تو بہت بڑے بڑے مفتیان کرام (جنہیں خوفِ خدا دامن گیر ہوتا ہے) ہفتوں ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں اور پھر کس مجبوری سے کسی کی تکفیر کا فتویٰ لکھتے ہیں یہ کچھ اُنہی کا دل جانتا ہے لیکن وہ اصرار کرتے چلے گئے، تو انہیں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عبارت دکھائی گئی کہ اگر اس نعرے پر ہی تکفیر کا دارومدار ہو تو پھر یہاں کیا حکم لگے گا، تب جا کر ان کا ''جذبہ مدح صحابہ رضی اللہ عنہم'' کچھ ٹھنڈا پڑا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

کاش اگر قتلۂ عثمان ده دوازده سال دیگر هم تن بصبر مے دادند وسکوت کرده می نشستند سند و هند و ترك و چین نیز مثل ایران وخراسان یا علیؓ یا علیؓ می گفتند آن اشقیا نه فهمیدند که هر چند عثمان بنی اُمیه را مسلط کرده وازدست ایشان کارگرفته اماآخر نام محمد وعلے است خراسان راعبداللّٰه بن عامر بن کریز فتح نموده وحالا درمشهد و سبزوار و نیشاپور وهرات غیراز نعره حیدرے شنیده نمی شود آخر چون عثمان ونبی اُمیه در ترك و چین و راجپوتانه وهندوسند نرسیدند محمد وعلے راهم مردم این دیار نشنا ختند وغیر از رام وکرشن و گنگا وجمنا پیری و مرشدے ندارند ودر چین و خطا وترك این قدر هم نیست که نام این بزرگان را کسے بشناسد وتعظیم نماید.

تحفه اثناعشریه ، باب دهم ، مطاعن عثمانؓ، طعن چهارم ، ص: ۳۱٤، مطبوعه سهیل اکیڈمی پاکستان.

افسوس اگر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل دس، بارہ برس صبر کرتے اور خاموشی سے بیٹھے رہتے تو سندھ، ہندوستان، ترک، چین میں بھی ایران اور خراسان کی طرح یا علی، یا علی کے نعرے بلند ہوتے۔ ان بدبختوں نے اس حکمت کو نہ سمجھا کہ اگرچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکومتی عہدے بنی اُمیہ کو دیئے ہیں اور انہی سے (فتوحات اور جہاد کا) کام لیا ہے لیکن نام تو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہی کا بلند ہوتا (یعنی اسلام ہی غالب آتا، کم سے کم ان ممالک میں کفر کا غلبہ تو نہ ہوتا) خراسان کو عبداللہ بن عامر بن کریز رضی اللہ عنہ نے فتح کیا تھا تو دیکھو اب (خراسان کے شہروں) مشہد، سبزوار اور نیشاپور میں سوائے نعرۂ حیدری کے کوئی اور بات تو سنائی نہیں دیتی۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ (کی فوج) ترکستان، چین، راجپوتانۂ ہندوستان، خود ہندوستان اور سندھ میں نہیں پہنچی تو ان ممالک میں بسنے والے لوگوں نے نہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پہچانا اور نہ علی (رضی اللہ عنہ) کو، رام، کرشن، جمنا اور گنگا کے علاوہ ان (ہندوؤں) کا اب کوئی پیرو مرشد نہیں ہے۔ اور چین، ترکستان، اور روس میں تو اتنا بھی نہیں ہے کہ ان بزرگوں کے نام سے بھی کسی کو شناسائی ہو یا کوئی ان حضرات علیہم السلام کی تعظیم بجالائے۔

اس عبارت کو دکھایا تو پھر مسئلہ ٹھنڈا پڑا۔

بہت سے دیگر مسائل کی طرح اب ایک مسئلہ تو یہ بھی بن گیا ہے کہ ہمارے ملک میں مزاج کی ٹھنڈک مفقود ہوتی چلی جارہی ہے اور کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ شرعی مسائل کو ہمیشہ طاقت اور زور کے بل بوتے پر منوایا جائے حالانکہ یہ مزاج دعوت وحکمت سے بالکل لگّا نہیں کھاتا اور دوسرے علماء میں وہ طبقہ بالکل معدوم ہوتا جارہا ہے جو ذوق مطالعہ رکھتے تھے اور امہات کتب مثل فتح القدیر، کتب ظاہرالروایۃ ،مبسوط سرخسی اور فصول ستہ وغیرہ کا مطالعہ کرتے تھے۔ جہاں مفتیوں کا معیار یہ ہونے لگے کہ اُردو فتاویٰ دیکھ کر فتوے صادر فرمائیں اُس معاشرے میں دین کی حالت کیوں نہ برباد ہوگی ایسے جذباتی اور نام نہاد مفتیوں کی خدمت میں بجز اس کے کیا عرض کیا جاسکتا ہے کہ

وہ فریب خوردہ شاہیں، جو پلا ہو کرگسوں میں ‏ ‏ ‏ ‏ اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

ان آنے والے صاحب کی خدمت میں یہ عبارت اور بار بار گذارش کی کہ محض اس نعرے کی وجہ سے اگر کسی کے اسلام اور کفر کا فیصلہ ہوگا تو اس فتویٰ کے زدّ حضرت اقدس شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ پر بھی جا کر پڑے گی اور وہ مسند الہند ہیں، ہر ایک سند حدیث میں انہی کا اسم گرامی آتا ہے۔ اگر معاذ اللہ وہ بھی اِس اُمت سے خارج ہوگئے تو پھر حدیث میں سند متصل کا کیا بنے گا؟ نعوذ باللہ من جمیع الفتن ماظھر منھا وما بطن.

---

⑨

جہاں تک اس الزام کا معاملہ ہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الندوی رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی تعلق نہیں رہا تو سب سے پہلے تو یہ عرض کرنا ہے کہ صرف اور صرف خدا کا خوف کریں۔ مرکر اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دینا ہے اس مالک حقیقی کے ہاں یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ کون شخص جھوٹا ہے اور کون سچا؟ قبر میں اور پھر آخرت میں جواب دینا ہے۔ خدا کے لیے جھوٹ بول بول کر اور جھوٹے

الزامات لگا کر اپنی عاقبت برباد نہ کریں۔ ان حرکتوں سے صرف عاقبت ہی برباد نہیں ہوتی بلکہ طریقت کے سلسلے بھی ایسے نہیں چلتے، بہت بے برکتی ہو جاتی ہے۔ بدعات کی ترویج اور اپنا قد بلند کرنے کے لیے دوسروں پر جھوٹ بولنا، برکات سے محرومی کا سبب بن جایا کرتا ہے۔ آخر ہم تاریخ سے سبق کیوں نہیں سیکھتے؟ صرف ایک صدی ہی تو گزری ہے حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ کے خلاف اہل بدعت نے وہ وہ الزامات اور جھوٹ بولا تھا کہ خدا کی پناہ۔ وہ بدعتی تو اس بات پر تل گئے تھے کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خلافت منسوخ کرا کے دم لیں گے اور مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یوں گھیرا ہوا تھا کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو غالباً حضرت سہارنپوری یا اپنے کسی اور خلیفۂ محترم رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بات ارشاد فرمانا پڑی تھی کہ میاں جیسے جا رہے ہو، ویسے ہی واپس آ جانا۔ اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو ان بدعتیوں کی تمام حرکات کی خبریں پہنچ رہی تھیں اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ صرف یہ فرماتے تھے کہ میاں ہم تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیے بیٹھے ہیں۔ اور یہ سب مکروہ حرکتیں کرنے والے بدعتی بھی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء ہی تھے۔ آج ایک صدی گزرتی ہے کہ ان بدعتیوں کے سلاسل تو کجا، نام ونشان تک مٹ گیا اور خدا نے برکت دی تو صرف حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ کے سلسلے کو۔ اس لیے خدا کا خوف چاہیے ایسی حرکتیں نہ کریں جن سے برکات سلسلہ سے محرومی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ابھی جنوری رفروری ۲۰۱۲ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ جانا ہوا، حیدرآباد بھارت میں حضرت مولانا رابع صاحب دام ظلہ کی خدمت میں حاضری رہی۔ سبھی حضرات نے بہت شفقت فرمائی بلکہ حضرت مولانا رابع صاحب مدظلہم نے تو ایک تحفے سے بھی نوازا اگر معاملہ یوں ہوتا جیسے کہ الزامات لگائے جا رہے ہیں تو کوئی تو اس بات کی تردید کرتا کہ تمہاری حضرت ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق کی باتیں یہ سب کچھ جھوٹ اور افسانہ ہے۔ بلکہ وہاں سے تو یہ معلوم ہوا کہ معترضین نے اس

سال حج کے موقع پر پورا زور لگا لیا کہ ندوہ والے کچھ تحریر کر دیں لیکن کسی نے ایک لفظ تک لکھ کر نہیں دیا آخر کار بے نیل و مرام لوٹے یہ الزامات لگانے میں شیر ہیں اور جب ناکام اور شرمندہ ہوتے ہیں تو پھر اپنی ان ناکامیوں کا ذکر نہیں کرتے۔صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا خوف، قبر اور آخرت میں جواب دہی کا احساس چاہیے۔

تیسری بات یہ ہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو عنایات فرمائی تھیں وہ تحریراً عنایات فرما کر اس دنیا سے تشریف لے گئے۔اب کوئی کیا کر سکتا ہے اور کوئی بھی شخص حضرت ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کو منسوخ کرنے کی اجازت یا ہمت رکھتا ہے؟ یا حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ نے جو نسبت عنایت فرمائی تھی (اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اب تک موجود ہے یا نہیں) وہ کوئی چھین سکتا ہے؟ ان کی عنایات اس سے بالا ہیں کہ اب کوئی تصدیق یا تردید کی سند جاری کرے۔شہر ہو کہ جنگل، لوگ اقرار کریں یا انکار وہ نسبت ان شاء اللہ ساتھ ہے۔اللہ تعالیٰ ہی محروم نہ فرمائے تو کسی کی کیا مجال ہے کہ وہ نسبت چھین سکے۔حق تعالیٰ شانہ اپنا تعلق حضرت ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے عنایت فرمائیں اور کوئی آدمی حتی کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ والے (جو نہایت واجب التعظیم اور اُن کا ادب واحترام سر آنکھوں پر) اُٹھ کر اسے چھین لیں یہ اعتقاد رکھنا کون سا دین اور طریقت ہے؟ سبحان اللہ حق تعالیٰ شانہ ہر چیز کے خالق و مالک اپنا تعلق اور نسبت عنایت فرمائیں اور مخلوق اُسے چھین لے کیا توحید الٰہی اور عقیدہ اھل السنۃ والجماعۃ یہی ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ جس آدمی کو تم کل تک کافر اور مرتد کہتے رہے وہ اب مسلمان کیسے ٹھہرا؟ اس نے کب اور کہاں اسلام قبول کیا ہے؟ اس کے پہلے اور اب کے عقیدے میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تو کیا تم نے اپنا سابقہ فتوئے کفر واپس لے کر اب اسے مسلمان کہنا شروع کر دیا ہے؟ اگر وہ شخص کافر ہے، اس کے پاس ایمان ہی نہیں ہے یا وہ مسلوب الایمان ہے تو پھر کہاں کی نسبت اور کون سی

اجازت وخلافت اور اگر وہ شخص پہلے ہی کی طرح مسلمان ہے تو پھر آپ کا فتویٰ کفر کہاں گیا؟ اپنی طبیعت کی خبر لیں ''پل میں تولہ پل میں ماشہ'' بس صرف یہ بتا دیجیے کہ وہ آپ کے نزدیک کہاں اور کب مشرف بہ اسلام ہوا ہے؟ اور یا یہ مانیے کہ ماضی میں بھی ہم جھوٹ کہتے رہے اور آج بھی یہی کام کررہے ہیں۔

پانچویں بات جو عرض کی جاتی رہی ہے کہ ایسا کیجیے اس جھوٹ بولنے اور پھیلانے سے اب تک آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ مہربانی فرما کر حضرت مولانا قاضی ظہور حسین صاحب مدظلہم، حضرت مولانا سید رشید میاں صاحب مدظلہم اور حضرت مفتی عبدالقدوس ترمذی صاحب مہتمم دارالعلوم حقانیہ ساہیوال پر مشتمل ایک کمیٹی بنالیجیے اور وہ فریقین کی پوری باتیں سن کر جو فیصلہ تحریر فرمادیں اس پر عمل کرلیا جائے۔ برامت مانیے اگر آپ کسی مسئلے کا حل چاہتے ہیں تو یہ ایک مناسب راہ ہے اِسے اختیار کرلیجیے اور اگر مسئلہ حل نہیں کرنا، صرف جھوٹ ہی بولنا ہے تو آپ جیتے ہم ہارے۔ آخر آپ اس مسئلے کے حل کے لیے صحیح راہ سے گریزاں کیوں ہیں؟

چھٹی بات یہ ہے کہ حضرت مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایسی شخصیت نہیں تھے کہ دنیا میں ان پر کوئی جھوٹ بولے اور اس جھوٹ کی تردید دنیا میں کوئی شخص اور خاص طور سے اہل ندوۃ العلماء لکھنؤ نہ کریں۔ بالکل صاف اور واضح طور پر حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر پیش کی تھی اور اب بھی آگے چل کر وہی پیش کی جارہی ہے دنیا کا کوئی صرف ایک شخص شرعی شہادت کے ساتھ یہ لکھ دے کہ یہ تحریر حضرت ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نہیں ہے تو اس کی شہادت شرعی سرآنکھوں پر، حتی کہ جن حضرات کو اعتراض ہورہا ہے وہی، صرف اور صرف شرعی شہادت دے دیں کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے اور اپنے بیت اللہ میں ہونے والے مباہلے کے متعلق بھی حقائق بیان فرمادیں تو چشم ماروشن دل ما شاد لیکن شرعی شہادت دیتے وقت یہ یاد رہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

شاهد الزور لا تزول قد ماه حتى يوجب الله له النار.

جھوٹا گواہ اپنے پاؤں شہادت کے مقام سے ہٹانے نہیں پاتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جہنم واجب کر دیتا ہے۔

مکرر عرض ہے کہ خدا کا خوف چاہیے چھوڑ دیں یہ جھوٹ پھیلانا۔ حضرت مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایسی ہستی نہیں تھی کہ ان پر جھوٹ بولا جائے اور دنیا میں ان کے حلقے کے افراد سے کوئی ایک بھی یہ شرعی شہادت نہ دیں کہ یہ جھوٹ ہے۔

عجیب تر مطالبہ یہ بھی ہے کہ ان تحریرات کی دوبارہ تصدیق ندوۃ العلماء والے کریں۔ کوئی پوچھے کہ اس کی وجہ؟ یہ تحریرات انہیں بھیجیں کیوں اور ان سے تصدیق کروائیں کیوں؟ ان معترضین کو تو دنیا میں اور کوئی کام نہیں۔ نہ مطالعے کا شوق، نہ تحریر سے مناسبت، نہ علم و تحقیق کا ذوق، ہر روز گھر بیٹھے نئے سے نئے اعتراضات پیدا کیا کریں اور کوئی ان کا خادم ہر دن ان کو جواب دے۔ یہاں اتنی فرصت کہاں؟ ان معاملات پر چونکہ بار بار لکھنا نہیں ہے اس لیے حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تعلق کے معاملے میں یہ آخری تحریر آخری مرتبہ پیش خدمت ہے۔ بغیر کسی لگی لپٹی کے یہاں کا مؤقف نہایت صاف، دوٹوک اور واضح ہے کہ

ہاں نہیں وہ خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

معترضین اپنا پورا زور لگا دیکھیں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کس کے کام اور آثار کو شرف قبولیت اور بقا سے نوازے گا اور کس کا چراغ گل کر دے گا۔ اتنی جلدی بھی کیا پڑی ہے ایک دو دہائیاں ہی تو ہیں، سب مٹی کے نیچے چلے جائیں گے اور سچ اور جھوٹ کا فیصلہ جس کے اختیار میں ہے وہاں نہ کسی کی سفارش چلے گی اور نہ ہی کوئی جھوٹی گواہی ہوگی۔ حضرت ندوی نور اللہ مرقدہ سے نسبت تھی، ہے اور ان شاء اللہ قائم رہے گی، اب نہیں تو قیامت میں یہ سچائی سب کے سامنے آ جائے گی اور اچھا ہوگا

کہ اللہ تعالیٰ سچوں کو اَجر دے گا اور جھوٹوں کو شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ حضرت مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے نہ آج تک کوئی فائدہ اٹھایا ہے اور نہ اس نسبت کی کہیں تشہیر کی ہے کہ ہم اس لائق ہی نہیں ہیں جو اُن کا احسان تھا، وہ جانتے ہوں گے کہ وہ کس لیے فرمایا تھا۔

بیعت اور اخذ وارشاد کے معاملے میں اپنا مؤقف ٹھیک وہی ہے جو حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نور اللہ مرقدہ کا تھا۔ ایک گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں۔

لیکن باید که منظور نظر احوال و اعمال خود باشد و ملحوظ سکون و حرکت خود بود مبادا که ترقیات مریدان باعث توقفات پیران گردد و حرارت مسترشدان در کارخانه مرشدان برودت اندازد ازین معنی ترسان ولرزان باید بود و احوال و مقامات مریدان رادر رنگ شیر و ببر باید دانست چه جائے آنکه بآنها مفاخرت و مباهات باید کرد که مبادا ازین راه دروازۂ عجب کشاده گردد بلکه باید که بحکم" الحیاء شعبة من الایمان " ترقیات مریدان باعث شرمندگی و خجالت باشد.

(دفتر اول ، درالمعرفت ، حصه چهارم، مکتوب دوصدوسی وهشتم، ص: ۳۸)

ضرورت اس بات کی ہے کہ آدمی اپنے احوال واعمال کو ملحوظ خاطر رکھے اور کسی معاملے میں پُرسکون رہنا اور کسی کام کو کرنے میں احتیاط کرے ایسے نہ ہو کہ مرید تو ترقی کرتے رہیں اور پیر کو اعمال صالح کی توفیق نہ ہو اور مریدوں میں تو حرارت و جذبہ الٰہی پایا جائے اور پیروں کا کام ٹھنڈا ہو یہ سوچ کر لرزتے اور کانپتے رہنا چاہیے اور مرید اپنے جن احوال ومقامات کی خبر دیں اُن کو ببر شیر کی طرح جاننا چاہیے (کہ وہ ایک درندہ ہے جو حملہ آور ہو رہا ہے) ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ مریدوں کے احوال پر فخر اور اُن پر ناز کیا جائے کیونکہ اس طرح عُجب اور غرور کا دروازہ خود انسان اپنے لیے کھول لیتا ہے بلکہ حدیث میں جو آیا ہے ''حیاء ایمان کا حصہ ہے'' تو مریدوں کی ترقی سے پیروں کو حیاء کرنی چاہیے اور اُن کی ترقی اپنے لیے شرمندگی اور خجل کا باعث ہونی چاہیے۔

جس زور وشور سے اور تقریر وتحریر سے مخالفت کی جارہی ہے موت کے بعد صبح اس مخالفت کو جھوٹ

قرار دے دے گی۔ اللہ تعالیٰ سے ڈریے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ نے اسی لیے ارشاد فرمایا تھا۔

هلك المتعنطون. (صحیح مسلم، ۲۰۵۵/٤، رقم الحدیث : ۲٦٧٠) بے جا تشدد کرنے والے مارے گئے۔

ساتویں بات یہ ہے کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق توڑنے کی ان کی یہ کوشش آج کی نہیں پچھلے پندرہ برس سے جاری ہے۔ اب یہ اپنی پچھلی پندرہ برس کی تاریخ اور کارنامے کسی کو نہیں بتاتے کہ جب حضرت مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ حیات تھے تو اس وقت بھی اِن کی پوری کوشش یہی تھی کہ اصلاح کے اس سلسلے کو تڑوا دیں، حضرت ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو بدظن کریں اور خاص طور سے اجازت کو منسوخ کرائیں یہ لوگوں کو کیوں نہیں بتاتے کہ ہمارا ماضی بھی ایسا ہی داغ دار اور مکروہ کاموں میں ملوث ہے، جو حرکتیں آج ہم کر رہے ہیں یہ تو محض فضل باری تعالیٰ تھا کہ حضرت ندوی رحمۃ اللہ علیہ آخری لمحے تک بھی ان کے دام فریب میں نہیں آئے وگرنہ انہوں نے اُن کی حیات طیبہ میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ رائے بریلی اور ندوۃ العلماء والوں کو ابھی اُن کے وہ خطوط نہیں بھولے جن میں یہ جھوٹے الزامات لکھا کرتے تھے۔

اصل قصہ یوں ہے کہ:

1987ء میں حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب نور اللہ مرقدہ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کیا تھا۔ ان کی خدمت میں حاضری اگرچہ اس سے قبل بھی ہوتی رہی تھی لیکن اب باقاعدہ رابطہ رکھنے کی توفیق ہوئی تھی اور 1994ء میں انڈیا آفس لائبریری لندن، جو کہ اب برٹش لائبریری کے نام سے مشہور ہے، مجھے مطالعے کی غرض سے کئی ماہ قیام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اُس وقت ہمشیرہ کا گھر لندن میں ہوا کرتا تھا اور وہیں پر یہ طویل قیام تھا۔ جولائی 1994ء میں رائے بریلی یا ندوہ فون کیا تو حضرت مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگست میں چند دن کے لیے آکسفورڈ

یونیورسٹی انگلینڈ میں آنا ہوگا تو وہاں آجائیں۔

اگست 1994ء کے بالکل آخری دنوں میں حضرت نوراللہ مرقدہ کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ 31 اگست 1994ء کی فجر کے بعد طلبی ہوئی تو اپنے سامنے بٹھا کر ایک تحریر زیبِ قلم کی اور کچھ باتیں زبانی بھی ارشاد فرمائیں۔ اس تحریر کا عکس ذیل میں پیش کیا جارہا ہے اور چونکہ یہ سب کچھ برجستہ تحریر فرمایا تھا اس لیے بعض الفاظ کے پڑھنے میں شاید کسی کو دقت ہو اس لیے اسے کمپیوٹر سے نکلوایا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰه و سلام علی عبادہ الذین اصطفٰی

امابعد، راقم السطور (ابوالحسن علی ندوی) کو اس امر کے اعتبار سے مسرت ہے کہ لندن میں مولوی محمد سعید خان صاحب سے ملاقات ہوئی اور چند روز ساتھ رہنا ہوا۔ وہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلۂ عالیہ محمدیہ نقشبندیہ میں داخل ہوئے۔ اور اس عاجز نے ان کو اس میں اجازت بھی دی۔ وہ دوسرے طالبین کو بھی اس سلسلۂ عالیہ میں داخل کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور اس سلسلہ میں داخل ہونے والوں کو اس سلسلۂ عالیہ مقبولہ کے حقوق ادا کرنے اور شکر کی توفیق عطا فرمائے۔ اور اس کی برکات میں حصہ عطا فرمائے۔

و ما ذلك علی اللّٰه بعزیز.

حضرت سید صاحب حکومت الٰہیہ کے قیام اور عمل بالشریعہ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جو جدوجہد فرماتے تھے۔ اور اسی سلسلہ میں جان عزیز دے دی۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں داخل ہونے والوں اور داخل کرنے والوں کو اس کے اجراء اور اس کے لیے سعی وجدوجہد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

راقم تائب و عاجز، ابوالحسن علی ندوی

۲۴ / ربیع الأول ۱۴۱۵ھ

۳۱؍اگست ۱۹۹۴ء

لندن

اب اسے باآسانی پڑھا جاسکتا ہے اور اصل تحریر کا عکس مندرجہ ذیل ہے۔

Phones: 73864, 72336, 72338

Abul Hasan Ali Nadwi
P. O. BOX. No. 93, NADWATUL ULAMA,
LUCKNOW—226 007, U. P. (INDIA)

أبو الحسن علي الحسني الندوي

Ref:

التاريخ:

یہ واقعہ دفعتاً پیش آیا تھا اور جب اس کمرے سے باہر آنا ہوا تو ہال میں حضرت نور اللہ مرقدہ کے موجودہ جانشین حضرت مولانا محمد رابع صاحب ندوی مدظلہم اور امریکہ میں رہائش پذیر، حضرت ندوی نور اللہ مرقدہ کے بیرون ملک اسفار کے لیے خاص خادم جناب عثمان صاحب مدظلہم بھی موجود تھے، ان حضرات نے خوشی اور حیرت کا اظہار فرمایا اور حضرت مولانا رابع صاحب مدظلہم نے اس تحریر کا عکس بھی لے لیا تھا۔

۱۴۱۵ھ کے بعد بھی اپنے حالات پیش کرنے کی توفیق ہوتی رہی یہاں تک کہ جمادی الثانی ۱۴۱۷ھ میں ایک دن ٹیلی فون پر فرمایا کہ جو حالت پیش آئی ہے اسے لکھ کر فیکس کر دو۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور اس سے اگلے دن لکھنؤ سے جو فیکس موصول ہوا، وہ بھی حضرت ندوی نور اللہ مرقدہ کی تحریر ہے۔ اس کا عکس بھی پیش خدمت ہے۔ کمپیوٹر سے صاف بھی کروالیا ہے براہ مہربانی ملاحظہ فرمالیجیے۔

Phone: 72914, 72336, 72938

Abul Hasan Ali Nadwi

P.O. BOX, No. 93, NADWATUL ULAMA,

LUCKNOW—226007, U.P. (INDIA)

Ref:
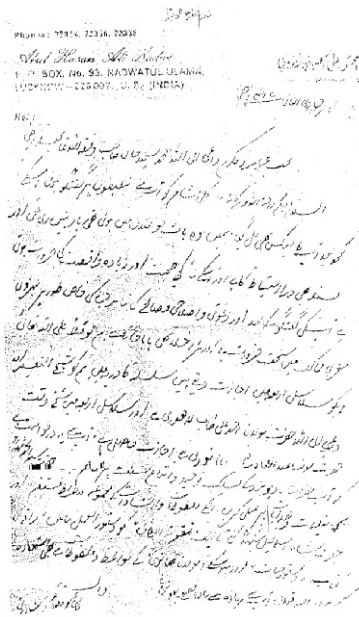
محبّ عزیز ومکرم داعی الی اللہ محمد سعید خان صاحب وفقه الله لما يحبّ ويرضىٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

کل شام کو آپ سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی اس کے

کچھ بعد آپ کا فیکس بھی مل گیا ہمیں وہ بات جو لندن میں ہوئی تھی، یاد نہیں رہی تھی اور مسئلہ بھی ذرا احتیاط کا ہے اور اس کے لیے کچھ صحبت اور زیادہ واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ

کی گفتگو کے بعد اور دعوتی و اصلاحی مصالح کی بنا پر جن کی خاص طور پر بیرونی مغربی ممالک میں سخت ضرورت ہے اور بڑا خلاء بھی پایا جاتا ہے۔ہم توکلاً علی اللہ تعالیٰ آپ کو سلاسلِ اربعہ میں اجازت دیتے ہیں .سلسلہ قادریہ میں ہم کو شیخ التفسیر اور داعی الی اللہ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ سے اور سلاسلِ اربعہ میں شیخِ وقت حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ سے اجازت حاصل ہے۔آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ حضرات دیوبند کے مسلکِ توحید واتباعِ سنت پر قائم رہیں اور سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات وہدایات پر عمل کریں۔ان کے ملفوظات وارشادات کے مجموعہ ''صراطِ مستقیم''اور حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ''تقویۃ الایمان''کو دستورالعمل جانیں راقم کی کتاب ''دستور حیات''اور ہو سکے تو مولانا تھانوی کے مواعظ وملفوظات سے بھی استفادہ کریں اللہ تعالیٰ آپ سے زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائے۔

والسلام

دعا گو:ابوالحسن علی الحسنی الندوی

حضرت ندوی نور اللہ مرقدہ کا یہ گرامی نامہ جمادی الثانی ۱۴۱۷ھ بمطابق اکتوبر 1996ء کا ہے۔

ان دونوں اجازت ناموں کو غور سے پڑھ لیجیے۔پہلی مرتبہ اجازت ۳۱ / اگست ۱۹۹۴ء کو عنایت فرمائی تھی اور صراحتاً یہ تحریر فرمایا تھا کہ ''اس عاجز (سید علی میاں صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ) نے ان (سعید) کو اس (سلسلۂ عالیہ محمدیہ نقشبندیہ سلسلے) میں اجازت بھی دی۔وہ دوسرے طالبین کو بھی اس سلسلۂ عالیہ میں داخل کر سکتے ہیں''اور دوسری مرتبہ اکتوبر ۱۹۹۶ء میں ان الفاظ میں دی تھی ''ہم توکلاً علی اللہ آپ کو سلاسل اربعہ میں اجازت دیتے ہیں''

اب جب یہ خبر پھیلی تو اس وقت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی

نور اللہ مرقدہ کے بعض خلفاء جو راولپنڈی، لاہور اور امریکہ میں تھے انہوں نے آسمان سر پر اُٹھالیا اور سبھی نے لکھنؤ اور رائے بریلی میں یہی خطوط لکھے کہ یہ شخص فتنہ ہے یہ شخص قادیانی ہے اور حضرت والا اس کی اجازت و خلافت منسوخ کریں۔ ان خطوط اور پیغامات کی اتنی بھرمار ہوئی کہ حضرت اقدس ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا فون آیا اور فرمایا کہ صورت حال خراب ہورہی ہے اور پاکستان میں ہمیں حضرت سید نفیس شاہ صاحب مدظلہم پر اعتماد ہے انہیں ہماری طرف سے لکھنؤ میں جو ایک سیمینار ہو رہا ہے اس میں شرکت کی دعوت بھی پہنچا دیجیے اور یہ قادیانیت کا کیا قصہ ہے، انہیں کہیے کہ زحمت فرما کر مختصر طور پر لکھیں۔

لاہور حاضری ہوئی اور پیغام پہنچایا تو حضرت سید نفیس شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو خود اپنے قلم سے خط لکھا اس کی عبارت پیش خدمت ہے اور اس ٹائپ کے بعد اصل خط بھی مندرج ہے تاکہ کسی کو کوئی شبہ نہ رہے۔

تاریخ ۷ اشوال المکرّم ۱۴۱۷ھ

سیدی ومولائی حضرۃ اقدس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ وبرکاتہ

امید ہے بفضلہٖ تعالیٰ مزاج عالی بخیر ہوگا۔

جناب مولانا محمد سعید خان کے ذریعے سلام و پیام پہنچا جزاك الله احسن الجزاء سیمینار میں شرکت کچھ مصروفیات کی بنا پر فی الحال مشکل ہے حاضری کو بہت جی چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

مولانا سعید خان صاحب کے بارے میں جو دریافت فرمایا ہے بندہ کی ناقص معلومات کے مطابق وہ قادیانی نہیں ہیں۔ قادیانیوں کا ایجنٹ ہونا بھی معلوم نہیں احقر دعاؤں کا بے حد

محتاج ہے۔مہربانی فرمائیں جملہ احباب کی خدمت میں سلام مسنون۔

نیازمند
احقر نفیس الحسینی
۱۷ شوال المکرّم ۱۴۱۷ھ

09 (MADANI HOSPITAL) FAX 0593460231

سیدی و مولائی حضرۃ اقدس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ بعافیت ہوں امید ہے مزاج عالی بخیر ہوگا۔

جناب مولانا سعید الرحمٰن صاحب کے ذریعہ سلام و پیام پہنچا۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء
سیمینار میں شرکت کچھ مصروفیت کی بنا پر فی الحال مشکل ہے
حاضری کو بہت جی چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔
مولانا سعید صاحب نے کہا کہ آپ نے جو دریافت فرمایا ہے تو
بندہ کی ناقص معلومات کے مطابق وہ قادیانی نہیں تھے۔ قادیانیت کا رجحان بھی
معلوم نہیں۔ احقر دعاؤں کا بیحد محتاج ہے۔ مہربانی فرمائیں
جملہ احباب کی خدمت میں سلام مسنون

نیازمند
احقر نفیس الحسینی
۱۷ شوال المکرم ۱۴۱۷

حضرت ندوی نوراللہ مرقدہ اس گرامی نامے سے مطمئن ہوگئے اور اس کے بعد لکھنؤ اور رائے بریلی رمضان المبارک میں حاضری ہوئی لیکن کوئی بات ارشاد نہیں فرمائی۔ اگر فرمایا تو صرف اتنا کہ ہم سے آپ کی اجازت کے بارے میں نظر ثانی کو کہا گیا تو ہم نظر ثانی اور نظر ثالث سب کچھ کر چکے۔ آپ ان باتوں کی طرف توجہ دیے بغیر اپنا دعوت الی اللہ کا کام کرتے رہیے۔ اور ہم نے اب منع کر

دیا ہے کہ اس سلسلے میں کوئی بات ہم تک نہ پہنچائی جائے۔ ان کی یہ تسلی ہر تسلی سے بڑھ کر تھی۔
ہر طرح سے ناکام ہونے کے باوجود یہ لوگ مسلسل خط لکھتے رہے۔ دنیا کو یہ لوگ کیوں نہیں بتاتے کہ ہم نے ۱۹۹۷ء سے لے کر ۲۰۰۰ء تک حضرت ندوی نور اللہ مرقدہ کو بدظن کرنے کی پوری کوشش کی لیکن ہم ناکام رہے۔ ان حضرات نے جو خطوط راولپنڈی کے مقامی علماء سے لکھوائے (خاص طور سے، جماعت اسلامی کے ایک سابقہ مولوی صاحب سے) اور جو خطوط لاہور اور امریکہ، کینیڈا سے لکھوائے ان کا اکثر حصہ، خود اِنہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا الندوہ لائبریری میں آج بھی محفوظ اور موجود ہے آج سے پندرہ (۱۵) سال پہلے جو الزامات انہوں نے تحریر کیے تھے وہ تحریر آج تک محفوظ ہے۔ آئیں اور اُسے دیکھ لیں۔ اس میں جو جو جھوٹ لکھا ہے کیا پندرہ برس میں اس کا کوئی ایک ثبوت بھی وہ فراہم کر سکے ہیں؟ ان کا فرض بنتا ہے کہ یہ اُن الزامات کو ثابت کریں وگرنہ خدا سے ڈریں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اِن کی اپنی صفوں میں ان کے اپنے جو غدار بیٹھے ہیں انہوں نے ہی ان خطوط کی نقول یہاں بھیج دیں آئیں اپنے خطوط کو دیکھیں اور جواب دیں۔ یہ اُن کی پندرہ برس پہلے کی کوششوں کی ناکامی کی داستان ہے اس لیے یہ جو آج ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ قصہ نیا نہیں۔ پندرہ برس سے اِن کا یہ ظلم جاری ہے اور یہاں پر سوائے خاموشی، صبر اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر بھروسے کے علاوہ کچھ نہیں نہ ان ظلم کرنے والوں کا تذکرہ، نہ ان کی غیبت اور نہ اپنے وقت اور صلاحیتوں کا ضیاع۔
پچھلے صفحات میں جو درخواست کی گئی ہے کہ علماء کی ایک کمیٹی بنا کر ان کے سامنے ہر فریق اپنا مؤقف بیان کر دے، اُس کمیٹی کے سامنے یہ تمام خطوط بھی پیش کر دیئے جائیں گے تاکہ پتہ چلے کہ ۱۹۹۷ء سے لے کر آج تک کی جو کردارکشی کی مہم جاری رکھے ہوئے ہیں، خود کتنے پانی میں ہیں جب سچ اور جھوٹ کی تنقیح ہوگی تو معلوم ہوگا کہ تلی میں خاک بھی نہ رہی۔ حضرت ندوی رحمۃ اللہ علیہ اس وقت بھی ان

کی آہ وفغاں سے متاثر نہیں ہوئے تھے اور صورتحال اس سال حج کے موقع پر ویسی ہی رہی۔ اب ایک نیا شوشہ میدان میں لائے ہیں اور وہ ایک خط ہے جو حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۲ جولائی ۱۹۹۶ء کو تحریر فرمایا ہے ’’مولانا مفتی سعید کے بارے میں آپ نے دریافت کیا ہے جواباً تحریر ہے کہ ہم ان سے واقف نہیں ہیں۔ ہمیں یاد نہیں آتا کہ کبھی ہم سے ملاقات بھی ہوئی ہو اور ہم شاذ و نادر کسی کو اجازت دیتے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔‘‘

اس گرامی نامے کی تشریح میں پہلی گزارش تو یہ ہے کہ حضرت ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی حیات طیبہ کے آخری دور میں بسا اوقات کوئی بات خیال میں نہیں رہتی تھی تو یا تو خدام کو یاد دلانا پڑتا تھا اور یا پھر خود دریافت فرمالیا کرتے تھے۔ ندوۃ العلماء اور رائے بریلی میں اس بات کا مشاہدہ بھی ہوا اور اس حقیقت کی تصدیق اب بھی ارباب علم وفضل ندوۃ العلماء سے بھی اور ندوۃ العلماء کے حلقے کے ہر اس شخص سے کرائی جاسکتی ہے جس کا تعلق حضرت ندوی نور اللہ مرقدہ کے آخری دور میں اُن کے ساتھ رہا ہے۔ نسیان اس عمر کا فطری تقاضا تھا۔ کیا حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کی حیات طیبہ کے آخری دور میں، عمر مبارک زیادہ ہو جانے کی وجہ سے یہی معاملہ نہ ہوا تھا؟ حضرت اقدس مولانا خان محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے آخری دور حیات کو دیکھنے والے اب بھی ہزاروں زندہ ہیں کیا حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ یہی عارضہ لاحق نہ ہوا تھا؟ اس لیے مقتضائے عمر ایسا ہوا اور یقیناً ہوا کہ ایک شخص بوقت تحریر یاد نہیں رہا تو اس سے کیا ثابت کرنا ہے؟

دوسری گزارش یہ ہے کہ یہ شخص خود اس قابل تھا ہی کہاں کہ حضرت نور اللہ مرقدہ کو ہر وقت یاد رہتا؟ ان کا حلقہ ارشاد وتربیت پوری دنیا تھی، ہزاروں نہیں لاکھوں ان کے مداح تھے تو اتنے وسیع وعریض حلقے میں ایک نالائق آدمی کی وقعت ہی کیا تھی کہ اسے یاد رکھا جاتا؟

تیسری گزارش یہ ہے کہ دونوں اجازت ناموں کو ملاحظہ فرمایا جائے تو پہلی مرتبہ اجازت

آکسفورڈ یونیورسٹی لندن میں ۳۱ ؍اگست ۱۹۹۴ء کو مرحمت فرمائی اور دوسری مرتبہ جمادی الثانی ۱۴۱۷ھ بمطابق اکتوبر ۱۹۹۶ء کو اور اس دوسرے گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں ''ہمیں وہ بات جو لندن میں ہوئی تھی یاد نہیں رہی تھی'' وہ لندن والی بات یہی اجازت نامے ہی کی تو بات تھی جو ۳۱ ؍اگست ۱۹۹۴ء کو پیش آئی تھی اور اب یادداشت میں محفوظ نہیں رہی تھی۔ حضرت نوراللہ مرقدہ کی خود اپنی یہ تحریر ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اُنہیں ہر وقت اپنے مجازین (جن کی تعداد ۳۹ کے قریب ہے) کی تعداد یاد نہ رہتی تھی۔ یہ بات بہت شرمندگی سے لکھی جارہی ہے کہ اس میں بے ادبی کا بھی ایک پہلو ہے لیکن یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ صورت حال کی وضاحت کن کے سامنے کی جارہی ہے۔

چوتھی گزارش یہ ہے کہ جس گرامی نامے کا اشتہار معترضین چھاپ چھاپ کر بانٹ رہے ہیں، اس کی تاریخ تحریر ۵ ؍ربیع الاول ۱۴۱۷ھ بمطابق 22 ؍جولائی 1996ء ہے اور حضرت ندوی نوراللہ مرقدہ نے جو (دوسری مرتبہ) اجازت نامہ تحریر فرمایا ہے، اس کی تاریخ جمادی الثانی 1417ھ بمطابق اکتوبر 1996ء ہے ان تواریخ کو بغور دیکھ لیجیے کہ معترضین کا خط تین ماہ پہلے کا ہے اور اجازت نامہ تین ماہ بعد کا ہے نہ جاننے کی خبر تین ماہ پہلے کی ہے اور اجازت نامہ تین ماہ بعد کا ہے تو ذرا ٹھنڈے مزاج سے سوچا جائے کہ اگر حضرت ندوی نوراللہ مرقدہ تین ماہ پہلے کسی شخص کو وقتی طور پر بوجہ عارضہ عمر شریف، بھول گئے تھے اور پھر تین ماہ بعد اُسی شخص کو انہوں نے اجازت عنایت فرمادی تو اب اعتراض کا کیا موقع باقی رہا؟

اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص قادیانی ہے یا وہ حضرت ندوی نوراللہ مرقدہ کا مجاز ہے بلکہ وجہ کچھ اور ہے اور وہ وجہ ہے اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بے نیازی، قبر اور آخرت میں جو پکڑ جھوٹ بولنے اور پھیلانے پر ہوگی اس سے لاپرواہی اور بے خوفی۔ اب بھی عرض ہے کہ اگر آپ اس مسئلے کے حل کے لیے سنجیدہ ہیں اور حقیقت تک رسائی چاہتے ہیں تو علماء کرام مدظلہم کی کمیٹی پر اتفاق کر لیجیے

اور ۱۵ / برس پہلے کے خطوط اور جو کچھ اب بھی لکھا اور پھیلایا جا رہا ہے، یہ سب کچھ ان کے سامنے پیش کیے دیتے ہیں پھر جو بھی فیصلہ وہ فرمادیں۔اس پر عمل کرلیا جائے، حضرت ندوی نوراللہ مرقدہ کے ساتھ تعلق کے معاملے میں عمر بھر کے لیے اب یہ آخری تحریر ہے۔اس کے بعد اس ردّ و کد کا سلسلہ ختم کرتے ہیں۔صرف ایک راہ باقی ہے اور وہ متعین علمائے کرام کی پنچائت آئندہ سے معترضین جو چاہیں لکھیں اور چھاپیں۔اتنی فرصت نہیں ہے کہ اب اسی پانی کو بلوتے رہیں۔ احباء و اعداء اب ادھر سے حضرت ندوی نوراللہ مرقدہ سے اجازت کے سلسلے میں کسی تحریر کی توقع نہ رکھیں۔

ربنا افتح بيننا و بين قومنا بالحق و انت خير الفاتحين.

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد سعید خان

سعید

بروز جمعرات

12 جمادی الاول 1433ھ

بمطابق

5 اپریل 2012ء